ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالموں کا فنی جائزہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

ثمینہ اسماعیل

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالموں کا فنی جائزہ

مقالہ نگار:

ثمینہ اسماعیل

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالموں کا فنی جائزہ

پیش کار: ثمینہ اسماعیل رجسٹریشن نمبر:M/U/S18/1456

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: _____

اقرارنامہ

میں ثمینہ اسماعیل حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم۔فل سکالر کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز صاحبہ کی زیرِ نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

ثمینہ اسماعیل

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
Abstract	viii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: اردو کالم نگاری اور ڈاکٹر شاہد صدیقی: بنیادی مباحث	۱
الف: تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۲
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۲
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۳
vii۔ مجوزہ موضوع ما قبل تحقیق	۳
viii۔ تحدید	۳
ix۔ پس منظری مطالعہ	۳
x۔ تحقیق کی اہمیت	۴
ب: کالم نگاری کیا ہے؟	۴
ا۔ کالم کے لغوی معنی	۶
۲۔ ادبی اور صحافتی زبان کا فرق	۷

	۳۔ کالم کے صحافتی اور اصطلاحی معنی	۱۰
	۴۔ اردو کالم کی روایت	۱۴
	۵۔ اردو کالم نویسی کی روایت تاریخِ برصغیر کے آئینے میں	۱۵
	۶۔ اردو کالم نویسی کی روایت تاریخِ پاکستان کے آئینے میں	۲۸
	۷۔ کالم کی اقسام	۳۳
ج:	ڈاکٹر شاہد صدیقی: تعارف	۴۳
	۔ حوالہ جات	۴۷
باب دوم: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے فنی لوازمات کا تجزیاتی مطالعہ		۴۹
الف:	ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا فنی مطالعہ	۴۹
	۱۔ بیانیہ انداز	۴۹
	۲۔ اختصار	۵۴
	۳۔ فصاحت و بلاغت	۵۸
	۴۔ منظر نگاری	۶۱
	۵۔ تجسس	۶۵
	۶۔ فطرت نگاری	۶۷
	۷۔ جزئیات نگاری	۶۹
	۸۔ جذبات نگاری	۷۱
	۹۔ سراپا نگاری	۷۲
	۱۰۔ تلازمہ خیال	۷۴
	۱۱۔ نثر میں شاعری	۷۷
	۔ حوالہ جات	۸۳

باب سوم: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب اور ان میں نثری اصناف کا رنگ: تجزیاتی مطالعہ ۸۹
الف: اسلوب کے بنیادی مباحث ۸۹
ب: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب ۹۲
ج: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ادبی اصناف کا رنگ ۹۷
د: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے موضوعات کا ہم عصر کالم نگاروں کے موضوعات سے تقابل ۱۱۷
۔ حوالہ جات ۱۲۱

باب چہارم: ماحصل ۱۲۵
الف: مجموعی جائزہ ۱۲۵
ب: نتائج ۱۳۲
ج: سفارشات ۱۳۳
۔ کتابیات ۱۳۴
۔ اشاریہ ۱۳۷
۔ ضمیمہ (انٹرویو: ڈاکٹر شاہد صدیقی) ۱۴۱

Abstract

Title:

Technical Review of Dr. Shahid Siddiqui's Urdu Column

Abstract:

The keynote of my thesis is "The Artistic Review Dr. Shahid Siddiqui's Urdu Columns". Dr. Shahid Siddiqui is a multidimensional personality who has utmost importance among the contemporary columnists. He writes Urdu columns in 'Daily Duniya' under the title "Zayr E Aasman". The literary work is clearly shown in his columns that is different than other contemporary columnists. One of the properties of his columns is that, he does not fire in the air blindly rather than whatever he illustrates, first, he observes, experiments and then he writes in his columns. That is why we find an element of interest in his columns, and the reader read it with great interest. His columns are read and liked publically due to his attractive and simple diction.

Dr. Shahid Siddiqui is the important literary figure of the present time. In terms of Urdu columnists, different aspects have been brought in front of us due to his thought of the art. He has also tried to bring the high-profile topics of the history where he has taken up the common issues of the monotonous life after research. That is why it is necessary to study his columns to bring the literary and artistic properties of his writings to the world.

The manual procedure has been adopted to expose the artistic flaws of Dr. Shahid Siddiqui's columns. He is one of the first writers of the Daily Duniya. The proposed research is significant in the sense that it has been analyzed the Urdu column. He has unique attractiveness in his columns. His columns are also popular in public because of their unique topics and general understanding. In the proposed research column, Dr. Shahid Siddiqui's literary status and individuality were instrumental in determining the significance of the research.

اظہارِ تشکر

مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے اللہ رب العزت کی شکر گزار ہوں جس کی خاص نظرِ کرم نے مجھے مقالے کی تکمیل تک پہنچایا۔ میں شکر گزار ہوں صدرِ شعبہ اردو، ڈاکٹر عابد حسین سیال، رابطہ کار، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر نعیم مظہر اور تمام واجب الا حترام اساتذہ کا جن کی رہنمائی سے میں یہاں تک پہنچی۔ خاص طور پر اپنی نگران پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے منزل مقصود تک پہنچنے میں میری بھرپور معاونت کی۔ میں اُستادِ محترم ڈاکٹر عبد الکریم اور دیگر تمام اساتذہ کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ادب پڑھنے کی طرف ہماری دلچسپی میں اضافہ کیا۔

میں اپنے والدین، بھائیوں، شریک حیات اور دیگر احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے قدم قدم پر آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں تہہ دل سے میں اپنے ہم جماعت کا شکریہ ادا کرتی ہوں اُن کی رہنمائی اور معاونت میرے لیے کارآمد ثابت ہوئی۔

ثمینہ اسماعیل

اسکالر ایم فل اردو

باب اول:

اردو کالم نگاری اور ڈاکٹر شاہد صدیقی: بنیادی مباحث

الف: تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف

مجوزہ موضوع کا عنوان "ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالموں کا فنی جائزہ" ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی ۱۸ اگست ۱۹۵۷ء کو راولپنڈی کے ایک علمی و ادبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ آپ کا شمار عصرِ حاضر کے اہم کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں کالم تحریر کرتے ہیں۔ آپ نے انگریزی اردو دونوں زبانوں میں ناول بھی لکھے ہیں۔ آپ ماہر تعلیم ہیں۔ آپ کی چونکہ معاصر ادب اور منظر نامے پر گہری نگاہ ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر نگاہ ہمیں آپ کے اردو کالموں میں دکھائی دیتی ہے۔ آپ روزنامہ "دنیا" میں "زیر آسمان" کے عنوان سے اردو کالم لکھتے ہیں۔ آپ کے ان کالموں میں ادبیت کی چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ آپ کالموں میں جہاں تاریخ و تمدن کی تصویر ملتی ہے وہیں آپ نے دورِ حاضر کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے اور ان کے حل کے لیے تجاویز بھی دی ہیں۔ آپ کے کالم روشِ عام سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ ان کے کالموں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے وہ جس جگہ کا ذکر کرتے ہیں وہاں جا کر مشاہدہ کرنے کے بعد تحقیقی کالم تحریر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ہمیں اُن کے کالموں میں دلچسپی کا رنگ ملتا ہے اور قارئین اُس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کے کالم عام فہم ہونے کی بنا پر عوامی سطح پر پسندیدگی اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ آپ کے اردو کالم ہمارے عہد کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں ان کے کالموں کی فنی جہات زیرِ بحث لائی جائیں گی۔

۲۔ بیان مسئلہ

ڈاکٹر شاہد صدیقی اہم ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اُن کے کالم ادبی، فکری اور فنی حوالے سے انفرادیت کے حامل ہیں۔ آپ کالم نگاری کے معاصر منظر نامے میں منفرد اور اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے اردو کالموں پر تا حال کوئی کام نہیں ہوا ہے اس لیے اُن کی کالم نگاری کو موضوع تحقیق بنایا جائے گا۔ اس تحقیق کا مقصد بطور کالم نگار ڈاکٹر شاہد صدیقی کی انفرادیت کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی کالم نگاری کا مطالعاتی تجزیہ پیش کرنا ہے۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ موضوع "ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالموں کا فنی جائزہ" پر تحقیق کے درج ذیل مقاصد ہیں:

۱۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا فنی حوالے سے تجزیہ کرنا

۲۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے اسلوبی خصائص کا جائزہ لینا

۳۔ معاصر اردو کالم نگاری میں شاہد صدیقی کا امتیاز اجاگر کرنا

۴۔ تحقیقی سوالات

۱۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کی کالم نگاری کے فنی محاسن کیا ہیں؟

۲۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے اسلوبی خصائص کیا ہیں؟

۳۔ فنی اور اسلوب کے حوالے سے معاصر کالم نگاروں میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کی انفرادیت کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار

ڈاکٹر شاہد صدیقی عصرِ حاضر کی اہم ادبی شخصیت ہیں۔ اردو کالم نگاری کے لحاظ سے ڈاکٹر شاہد صدیقی کے فکر و فن سے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جائے گا۔ اُن کے کالموں میں ادبیت کے کئی رنگ بھرے پڑے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے جہاں روز مرہ کے عام موضوعات پر قلم اُٹھایا وہیں تاریخ کے اعلیٰ پائے کے موضوعات کو بھی تحقیق کے بعد سامنے لانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کالموں کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کی تحریروں میں موجود ادبی اور فنی خصائص کو دنیا کے سامنے لایا جاسکے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا جس کے مطابق درج ذیل امور پیشِ نظر رہیں گے۔

الف۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی اور ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات اور انٹرویوز

ب۔ معاصر ادبی جرائد میں شائع ہونے والے تبصرے اور تجزیے

ج۔ سرکاری و نجی کتب خانوں میں متعلقہ کتب سے استفادہ

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کی فنی جہات کا موضوع در اصل نئی زمینوں کی سیر کا نام ہے۔ آپ نے ایک اردو ناول تحریر کیا جس پر ایم۔اے کی سطح پر کام ہوا ہے جبکہ آپ کے اردو کالموں پر اس سے قبل تحقیقی نوعیت کا کام نہیں ہوا ہے۔ اس طرح یہ موضوع منفرد ہو جاتا ہے۔ ان کالموں کی فکری جہات کو سمجھنے اور اس کا اپنے عصر سے ان کا گہرا ربط تلاش کرنے کی اس سے قبل کوئی کوشش سامنے نہیں آئی۔

۸۔ تحدید

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں نہ صرف ناول لکھے ہیں بلکہ کالم بھی تحریر کیے ہیں۔ تاہم مجوزہ تحقیق میں اُن کے فقط اردو کالموں کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے گا۔ اُن کا پہلا کالم ۱۲ ستمبر ۲۰۱۷ء کو چھپا لہٰذا ستمبر ۲۰۱۷ء سے مارچ ۲۰۱۹ء تک کے کالم شاملِ تحقیق ہوں گے جو روزنامہ "دنیا" میں "زیرِ آسمان" کے عنوان سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعے کے طور پر معاصر نثری ادب اور اس حوالے سے لکھے گئے تنقیدی مضامین، تبصروں، تجزیوں اور آراء کو پیش نظر رکھا جائے گا جو مختلف اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

ڈاکٹر شاہد صدیقی روزنامہ "دنیا" کے صفِ اول کے لکھاریوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ آپ ایک مصنف، کالم نگار، ناول نگار اور محقق ہیں۔ آپ نے اردو میں ایک ناول "آدھے ادھورے خواب" تحریر کیا اس کے علاوہ انگریزی میں بھی متعدد کتابیں تحریر کیں۔ مجوزہ تحقیق اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں اُن کی اردو کالم نگاری کا فنی جائزہ لیا جائے گا۔ آپ کے کالموں میں دلکشی منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ آپ کے کالم انوکھے موضوعات اور عام فہم ہونے کی بنا پر عوام میں پسندیدگی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق کالم نگاری میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ادبی مقام اور انفرادیت کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔

ب: کالم نگاری کیا ہے؟

دور جدید کی صحافت میں کالم نگاری کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ کالم کے بغیر اب کوئی بھی اخبار مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ جس طرح خبر اخبار کے لیے ضروری ترین چیز ہے بالکل اسی طرح کالم کے بغیر بھی اخبار کا تصور کرنا ممکن نہیں ہے۔ کالم نگاری میں کالم نگار اپنے گرد و پیش میں ہونے والے روز مرہ کے حالات و واقعات ، مسائل و مشکلات اور مختلف نوعیت کے معاملات پر قلم اٹھاتے ہوئے اسے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ جنہیں قارئین نہایت ہی ذوق و شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور حالات و واقعات سے آگاہ رہتے ہیں کہ عصر حاضر میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

اس طرح مختلف اخبارات میں ہمیں مختلف موضوعات پر کالم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ موضوعات سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، ادبی، نفسیاتی، اقتصادیاتی، سائنسی، طبیعاتی، تاریخی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ غرض کہ کالم ہر اس موضوع پر تحریر کیا جا سکتا ہے جو حالات اور وقت کا تقاضا ہو۔ کالم نگاری ایک ایسی صنف نثر ہے کہ جس نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ صنف نثر دن بدن پروان بھی چڑھی ہے۔ کالم نگاری اصل میں ہے کیا؟ اسی ضمن میں اقبال قادری اپنی کتاب "رہبر اخبار نویسی" میں رقم طراز ہیں۔

"کالم نویسی ایک تکنیکی ہنر ہے۔ جس اخبار کے صفحات پر رائے کا اظہار کرنے والا موجود نہیں ہوتا وہ ایک بے روح اخبار سمجھا جاتا ہے۔ کالم خیالات کے اظہار کا ایک عمدہ اور پر تاثیر وسیلہ ہے۔ کالم کے ذریعے ہزاروں قارئین کو دعوت فکر ملتی ہے۔"(۱)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ کالم نگاری ایک ایسی تکنیک کا نام ہے ایک ایسا فن ہے جس کے الفاظ قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسے اظہار کا نام ہے جو نہایت ہی عمدہ دلکش اور جاذب اثر ہوتا ہے۔ کالم نگاری کا دامن پھیلا ہوا ہے اور کالم نگاری کا یہ سفر کامیابی سے اپنے راستوں پر رواں دواں ہے۔ کالم نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ظہور احمد ایوان لکھتے ہیں کہ:

"کالم بنیادی طور پر صحافت کا حصہ اور صحافت کے اندر سے پیدا ہونے والی تحریر ہوتی ہے مگر رفتہ رفتہ کالم نگاری ایک ارتقاء پذیر فنی اکائی کے روپ میں بھی ظاہر ہو رہی ہے۔" (۲)

صحافت کی دنیا میں کالم نگاری کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک کالم نگار اپنے مخصوص علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے حالات و واقعات اور مختلف نوعیت کے معاملات کی سچی کھری، صاف، صحیح اور واضح تصویر اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے اور تصویر کے دونوں رخ سے پردہ اٹھاتے ہوئے قارئین تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔

کالم نگاری ہی کے ذریعے عوام الناس کو دعوت فکر ملتی ہے اور وہ بھی اپنی ایک مخصوص رائے متعلقہ کالم کے حوالے سے قائم کر لیتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کالم نگاری صحافت سے وابستہ ایک پیشے کا نام ہے جس میں ایک کالم نگار کا کام اخبارات اور جرائد میں مضامین یعنی کالم لکھنا ہوتا ہے۔ یہ کالم یا مضامین ایسے ہوتے ہیں کہ جو ایک کالم نگار اپنے نظریات اور مشاہدات کی روشنی میں مختلف قسم کے موضوعات پر مضامین یا کالم لکھتا ہے جو کہ پھر کئی اخبارات و رسائل میں چھپ کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کالم نگاری کیا ہے اس ضمن میں مختلف لکھاریوں نے اپنے اپنے انداز میں تحریر کیا ہے۔ ہر لکھاری نے اپنا ہی نکتہ نظر بیان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے سامنے کالم نگاری کے حوالے سے مختلف ادباء کی تحریریں آتی ہیں۔

۱۔ کالم کے لغوی معنی

کالم کے لغوی معنی کو اگر دیکھا جائے تو مختلف لغات میں مختلف معانی سامنے آتے ہیں مگر لغوی معنی معلوم کرنے سے قبل ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ کالم در حقیقت کہاں سے انگریزی زبان میں آیا۔ کالم قدیم فرانسیسی زبان کے لفظ Colonne، لاطینی زبان کے لفظ Columna اور یونانی کے لفظ Columne سے انگریزی زبان میں داخل ہوا۔ اس کے معانی جب ہم لغات میں دیکھتے ہیں تو لاٹھ، ستون، کھمبا، عمودی تقسیم یا کھم کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے اور اس کا استعمال دوسرے معانی میں کیا جا سکتا ہے مثلاً مختلف اعداد کو جمع کرنے کی غرض سے اوپر نیچے رکھا جاتا ہے تو انہیں (Column of figure) کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح فوج کے دستہ کو (Column of soldiers) کہتے ہیں۔ اسی طرح وطن کے چھپے ہوئے دشمنوں کے لیے فقط کالم کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں یعنی ایسے عناصر جن کی ہمدردیاں اپنے وطن کے دشمنوں سے ہوں۔

وارث سرہندی علمی اردو لغت میں کالم کے معانی کچھ یوں تحریر کیے:

"کالم (انگ ، وز)، (Colum)، صفحے کا حصہ ، خصوصاً اخبار کا خانہ ۲، فوج کا ایک دستہ"(۳)

اسی طرح قومی انگریزی اردو لغت میں لفظ (کالم) کے حوالے سے لکھا ہوا ہے:

" ا۔ کالم، کھمبا، تھم، ستون، لاٹھ، مینار، لمبا، پتلا، اور سیدھا شافٹ یا ستون

۲۔ اخباری صفحہ کا کالم، ایک صفحہ پر عمودی چھپی ہوئی دو یا تین سطروں میں سے ایک؛ اخبار یا رسالے میں مخصوص موضوع (مثلاً سیاست، فنون لطیفہ، محبت کرنے والوں کے لیے مشورے وغیرہ) کا شعبہ جس کی تحریر و ادارت کسی صحافی، مصنف یا خود ایڈیٹر کہ ذمہ ہو۔"(۴)

مندرجہ بالا دونوں لغات کا مقصد ایک ہی ہے کہ کالم در حقیقت صفحے کے حصے کا نام ہے خاص طور پر اسے اخبار کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی کہ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی مخصوص عنوان / موضوع پر لکھی گئی تحریر کو کالم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اگر انگریزی لغت میں لفظ کالم کو دیکھا جائے تو اس کے جو معانی سامنے آتے ہیں وہ کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں۔

"1.An upright pillar supporting a structure or standing alone as a monument

2. A line of people or vehicles moving in the same direction

3. A vertical division of a page or piece of writing

4. A regular section of a newspaper or magazine on a particular subject or by a particular person." (5)

یعنی کالم کے بارے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کالم ایک سیدھا ستون جو کسی ڈھانچے کی حمایت کرتا ہے یا یادگار کے طور پر تنہا کھڑا ہے۔ یا پھر لوگوں یا گاڑیوں کی ایک لائن جو ایک طرف جارہی ہو۔ اسی طرح کسی صفحے یا تحریری ٹکڑے کی عمودی تقسیم کو بھی کالم کہتے ہیں۔ اخبار یا رسالے میں کسی خاص شخص کی مسلسل چھپنے والی تحریریں۔

۲: ادبی اور صحافتی زبان کا فرق

اگر چہ ادب اور صحافت کا ساتھ چولی دامن کا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں کچھ فرق بھی موجود ہے۔ ہر صحافتی چیز کو ہم ادب کے زمرے میں شامل نہیں کرسکتے بلکہ کچھ خاص اوصاف اگر کسی تحریر میں موجود ہوں تو اس کو ہم ادب کے دائرے میں شامل کرسکتے ہیں۔ صحافت ایک الگ شعبہ ہے اور ادب الگ اپنی دنیا رکھتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں کی زبان میں بھی نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ادبی تحریروں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ان کا رنگ صحافتی تحریروں سے مکمل طور پر الگ ہوتا ہے۔ ادبی اسلوب اور زبان کیسی ہوتی ہے اس کے بارے میں ہم نور اسلام ندوی کی کتاب، رہنمائے صحافت کی ورق گردانی کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے:

"ادب تخیلات کی دنیا میں پرواز کرتا ہے وہ اپنی تحریر میں حسن و جمال پیدا کرنے کے لیے مسجع و مقفع الفاظ استعارے اور تمثیلات کا سہارا لے کر خالصتاً ادبی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔"(۶)

ادبی تحریروں میں تخیل کی پرواز سے کام لیا جاتا ہے۔ خیال کے سہارے ادیب بات کو آگے لے کر چلتا ہے۔ وہ اشیاء کی تخیلاتی تصاویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان خیالی تصاویر کے لیے وہ رومانوی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جن سے تصاویر بڑی شوخ اور رنگین ہو جاتی ہیں۔ ان تصاویر کی دلکشی سے قاری مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ مصنف ادبی تحریروں میں اپنی فنی چابکدستی سے اپنی تحریروں کو خوبصورت بناتا ہے۔ ادیب اپنے اسلوب زبان و بیان پر خاص زور دیتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ کمال مہارت کے ساتھ کرتا ہے۔ ادیب کے پیش نظر زبان کی اصلاح اور درست زبان کا استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ صحافی کے نزدیک واقعہ اہم ہے اور زبان کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ادب ایک مخصوص طبقے کے لیے ہوتا ہے اس لیے اس کی زبان بھی مخصوص ہوتی ہے جبکہ صحافتی زبان آسان اور عام فہم ہوتی ہے کیونکہ یہ خاص طبقے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس میں تمام طبقے شامل ہوتے ہیں: "صحافتی زبان معاشرے کے تمام طبقوں سے تعلق رکھتی ہے اور یکساں اثر رکھتی ہے۔"(۷)

صحافتی زبان آسان ہوتی ہے الفاظ سادہ ہوتے ہیں اس میں زبان کی آرائش اور زیبائش پر زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا کیونکہ صحافی کا مقصد زبان کی اصلاح اور ترقی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی بات کو نچلے طبقے اوسط طبقے اور اونچے طبقے سب کے لیے نمایاں رکھتا ہے۔ وہ کسی حلقہ بندی کا شکار نہیں ہوتا۔ ادیب تو حلقہ بندیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی فکر و نظر پر طرح طرح کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ اس بارے میں صحافی بالکل الگ رخ کا حامل ہوتا ہے:

"صحافی حلقہ بندی سے ماورا ہوتا ہے۔ وہ ہر میدان کا مرد مجاہد ہوتا ہے۔ اس کی تحریریں اور خبریں ہر کوئی پڑھتا ہے۔"(۸)

جبکہ صحافتی تحریر کی بانسبت ادب کا مطالعہ مخصوص لوگ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مخصوص رنگ ہوتا ہے۔ ادیب اسی رنگ کو اپناتا ہے جو قاری کو پسند ہو۔ وہ اپنی زبان کو بھی اس مخصوص طبقے کے لیے ہی رکھتا ہے جبکہ صحافی اس غرض سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی تحریریں تمام افراد کے اور تمام گروہوں کے لیے ہوتی ہیں۔ اس طرح کالم جو کہ صحافتی ہی کی قسم ہے لیکن ان میں سے کچھ کالم ادب کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ کالم صحافتی زبان میں شمار ہوتے ہیں۔ کالموں کی زبان بھی مختلف اقسام کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ بعض کالم سادہ الفاظ میں تحریر ہوتے ہیں اور بعض صاف اور شستہ ادبی زبان میں لکھے جاتے ہیں:

> "ادبی زبان میں لکھنے والا اپنے منفرد اسلوب بیان سے ممتاز مقام حاصل کرتا ہے ۔۔۔۔۔ صحافتی زبان ایک اجتماعی شعور کی علامت اور سماجی شعور کی ترقی و ترویج کی بنیاد بن گئی ہے۔"(۹)

دراصل ادیب کا اسلوب اسے اپنے معاصرین اور متاخرین میں نمایاں مقام دلاتا ہے۔ ادیب اپنی زبان و بیان کے طفیل ادب میں نمایاں اور منفرد مقام حاصل کرتا ہے۔ جس ادیب کا مطالعہ گہرا اور زبان پر گرفت مضبوط اس کی تحریروں کو قارئین میں نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے۔ ان تحریروں میں ایک منفرد رنگ جھلکتا ہے جو مصنف کو الگ شناخت عطا کرتا ہے جبکہ صحافتی زبان کسی طبقے سے محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر طبقے اور ہر طرح کی ذہنی سطح رکھنے والے قاری کے لیے ہوتی ہے۔ اس کی تفہیم آسان ہوتی ہے۔ تشبیہات، رموز و علامات سے پاک ہوتی ہے۔ صحافی زبان سے زیادہ واقع کو اہمیت دیتا ہے جبکہ ادیب زبان کی تراش خراش میں مصروف رہتا ہے۔

ادیب کے ہاں طرح طرح کی خواہشات اور امنگیں ہوتی ہیں۔ ادیب کے جملے زیادہ طرح شرطیہ ہوتے ہیں۔ جبکہ صحافت کا تعلق حقائق کے بیان سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا انداز بیانیہ ہوتا ہے:

> "ادب اگر خواہش اور امنگوں کا نام ہے تو صحافت حقائق شناسی اور عمل کا نام ہے۔ ادب اگر عدم ہے تو صحافت وجود ہے۔"(۱۰)

ادب میں تخیل کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں خیال کو بھی فوقیت حاصل ہے جبکہ صحافت تو حقائق کو جیسے دیکھا ویسے ہی بیان کر دینے کا نام ہے۔ اس طرح زبان میں بھی یہ جہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ ادب میں داستان،

افسانے اور ناول جیسی اصناف ہیں۔ جن میں حقیقت کے ساتھ ساتھ تخیل کی بھی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ اس طرح ادب اور صحافت دو الگ الگ میدان ہیں۔ صحافت حقائق کے بیان کرنے کو فوقیت دیتی ہے جبکہ ادب حقا ئق میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بھی شامل کرتا ہے۔ اس طرح صحافتی زبان سادہ اور بیانیے پر زیادہ زور دیتی ہے جبکہ ادبی زبان دو اوصاف کے علاوہ رموز، علائم، فصاحت اور بلاغت کے تمام رنگ لیے ہوئے ہوتی ہے۔

۳۔ کالم کے صحافتی اور اصطلاحی معنی

کالم کے صحافتی معنی کو اگر دیکھا جائے تو اخباری دنیامیں یہ لفظ دو حصوں میں مستعمل ہے۔ پہلا معنی تو یہ سامنے آتا ہے کہ اخبار کے صفحوں کی عمودی نوعیت کی تقسیم کو کالم کہا جاتا ہے۔یہ کالم خبروں، اشتہاروں اور دوسرے مواد کی ترتیب میں مدد فراہم کرتے ہیں ۔ اگر معیاری تقسیم کو دیکھا جائے تو پاکستان میں اخبارات کے صفحات کی یہ تقسیم آٹھ کالموں کی صورت میں کی جاتی ہے ۔ اگر دوسرے معنی کو دیکھا جائے تو اخباراتی دنیا میں کالم سے مراد ایک مخصوص صنف تحریر ہے جو کوئی تحریر نگار یا لکھاری اپنے اصلی یا پھر قلمی نام کے ساتھ کسی مستقل عنوان پر باقاعدگی سے تحریر کرتا ہے اور ایسے لکھاری کو صحافتی دنیا میں کالم نگار یا قلم نویس کہتے ہیں۔اسی ضمن میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کالم کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ”مستقل عنوانات کے تحت چھپنے والی تحریروں کو صحافتی اصطلاح میں کالم یا خصوصی کالم کہتے ہیں اور لکھنے والے کے لیے کالم نویس یا کالم نگار کی اصطلاح رائج کی جاتی ہے۔“(۱۱)

یعنی ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ کالم مستقل عنوان کے تحت کسی بھی اخبار میں شائع ہونے والی تحریر کا نام ہے بالکل یہی انداز بیاں محمد اسلم ڈوگر کا بھی ہے جو کہ اپنی کتاب فیچر ، کالم اور تبصرہ میں کالم کے صحافتی معنی کے بارے میں رقمطراز ہیں :

> ”کالم کا لفظ اخبار میں شائع ہونے والی ان تحریروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی مستقل عنوان کے تحت کالم نویسی کے نام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔“(۱۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی مستقل عنوان کے تحت اخبارات، جرائد میں ہی باقاعدگی سے شائع ہونے والی تحریر کو کالم کہتے ہیں۔اسی طرح اگر ہم کالم کے اصطلاحی معنی کا جائزہ لیں تو یہ بات اجاگر ہوتی ہے تو جب باقاعدگی کے ساتھ کسی خاص عنوان یا موضوع پر کوئی تحریر کسی اخبار میں شائع ہوتی ہے تو ایسی صنف تحریر کو اصطلاحی معنوں میں کالم کہتے ہیں۔

یعنی کالم ایک ایسے صحافی یا اہلِ قلم کی تحریر ہے جو وسیع علم، فکر و نظر، تجربے اور بصیرت کا حامل ہو۔ جو عصرِ حاضر کے حالات و واقعات کو عمدہ انداز میں بیان کر سکتا ہو۔ اپنے انوکھے، نرالے اسلوب بیاں سے حالات حاضرہ سے عوام الناس کو باخبر رکھتا ہو اور اپنا انفرادی اسلوب رکھتا ہو کیونکہ اگر کالم میں انفرادیت نہ ہو تو اسے بھی صحافتی تحریر کہا جاسکتا ہے لیکن اسے کالم کا نام بہر حال نہیں دیا جاسکتا۔ کالم نویسی کے بارے میں مخصوص تحریر کا جو تصور ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے اس کو چند الفاظ کی شکل دینا یا کسی ایک مخصوص تعریف میں سمونا مشکل ہے۔ دنیا بھر میں موجود مختلف کالم نگاروں نے کالم نگاری کے بارے میں جو مختلف نوعیت کی آراء دی ہیں وہ یقیناً ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور کئی ایک جیسی بھی ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی رائے کو ہم حتمی رائے قرار نہیں دے سکتے۔ کالم کے بارے میں جو رنگ برنگی آراء اور تعریفیں سامنے آتی ہیں وہ مکمل نہیں ہیں کیونکہ ہر تعریف یا رائے میں کوئی نہ کوئی پہلو نظر انداز کیا گیا ہے۔ تاہم ان تمام تر تعریفوں اور آراء سے کچھ خاص نکات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ کالم خیالات کے اظہار کا نہایت ہی عمدہ اور پُر تاثیر وسیلہ ہے۔

۲۔ کالم صحافت کے اندر سے پیدا ہونے والی تحریر ہے۔

۳۔ کالم کسی مستقل عنوان کے تحت لکھی جانے والی تحریر کا نام ہے۔

۴۔ اخبار یا رسالے میں مخصوص موضوع کا شعبہ جس کی تحریر و ادارت کسی صحافی، مصنف یا خود ایڈیٹر کے ذمہ ہو۔

۵۔ کالم ایک ستون ہوتا ہے جو کسی ڈھانچے کی حمایت کرتا ہے۔

۶۔ کسی صفحے یا تحریری ٹکڑے کی عمودی تقسیم کو بھی کالم کہتے ہیں۔

۷۔ اخبار یا رسالے میں مسلسل شائع ہونے والی کسی خاص شخص کی تحریریں کالم کہلاتی ہیں۔

۸۔ عصرِ حاضر کے حالات و واقعات سے قارئین کو مطلع رکھنا اور ان کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کرنا بھی کالم نگاری کہلاتی ہے۔

۹۔ ایک لکھاری جب اصلی یا پھر قلمی نام کے ساتھ باقاعدگی سے کسی مخصوص عنوان یا موضوع پر کوئی تحریر قلمبند کرتا ہے تو اسے کالم کا نام دیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام تر نکات کے پیش نظر کالم کی ایک جامع تعریف کو اس انداز سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ مخصوص نام کے ساتھ لکھی جانے والی ایسی تحریر جو کسی خاص عنوان یا موضوع پر باقاعدگی سے اخبار یا رسالے کی زینت بنے اسے کالم کہتے ہیں۔ جس میں موجودہ حالات و واقعات کے پس منظر میں معاشرے یا زندگی کے مختلف نوعیت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس تعریف کو ہم کالم کی ایک جامع اور مکمل تعریف کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں ایک معیاری کالم کی خصوصیات سمو دی گئی ہیں اور اس تعریف سے ہم کالم کی چند خوبیوں کو بھی اجاگر کر سکتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ کالم ایک ایسی تحریر کا نام ہے جو اخبار یا رسالے میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ باقاعدگی سے لکھی جانے والی تحریر کا نام کالم ہے۔

۳۔ کسی خاص موضوع یا عنوان پر لکھی جانے والی تحریر کالم کہلاتی ہیں۔

۴۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تحریر نگار کا نام بھی درج ہوتا ہے۔

۵۔ کالم میں تازہ حالات و واقعات بھی بنیادی یا اساسی درجہ رکھتے ہیں۔

۶۔ کالم کے لیے انسانی زندگی اور معاشرے سے موضوعات تلاش کیے جاتے ہیں۔

۷۔ کالم کی تحریر کا اسلوب منفرد ہوتا ہے۔

یعنی کالم اخبار یا رسالے میں کسی مخصوص عنوان کے تحت شائع ہونے والی باقاعدہ تحریر کا نام ہے۔ ہمارے گرد و پیش ایسے بے شمار موضوعات بکھرے پڑے ہیں جن پر ایک لکھاری قلم اٹھاتا ہے ایسے لکھاری کو اخباری دنیا میں کالم نویسی یا کالم نگار بھی کہتے ہیں۔ ہر کالم نگار اپنے اپنے انوکھے انداز سے کالم تحریر کرتے ہیں اور قارئین کو حالات و واقعات سے باخبر رکھتے ہیں نہ صرف باخبر رکھتے ہیں بلکہ جہاں معاشرے کے مختلف موضوعات کو موضوع سخن بناتے ہیں وہاں عوام کی اصلاح کے لیے مشورے بھی دیتے ہیں یوں اپنا نکتہ نظر عام عوام تک پہنچاتے ہیں اور ایک سوچ کو منتقل کرتے ہیں۔ کالم میں کالم نگار کی شخصیت کا رنگ بھی غالب ہوتا ہے کالم نگار اپنی تحریروں میں اکثر و بیشتر معاملات و واقعات کے ایسے نکات، پہلو اور معاملات سامنے لاتے ہیں جن تک قارئین صحافت کی دوسری اصناف کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر شفیق جالندھری لکھتے ہیں:

> "کالم میں شخصی رنگ غالب ہوتا ہے۔ تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختگی اور دوستانہ ماحول موجود ہوتے ہیں۔ اس کی تحریروں میں لکھنے والے کی اپنی ذات پوری طرح نمایاں ہوتی ہیں۔"(۱۳)

کالم نگاری کے ضمن میں یہ بات وثوق سے کی جا سکتی ہے کہ کالم ہر طرح کے موضوع پر تحریر کیا جا سکتا ہے۔ انفرادیت کالم کی پہچان ہوتی ہے اور یہ کالم کا لازمی جزو بھی ہے۔ کالم کا باقاعدگی سے شائع ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک ایسی تحریر جسے ہر سوجھ بوجھ، عقل فہم اور علم والا شخص اپنے مخصوص انداز میں تحریر کر سکتا ہے اور کالم کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہر نوعیت کے موضوع کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ کالم نگاری کے ذریعے ایک تجربہ کار شخص یعنی کالم نگار اپنے ذاتی خیالات و تصورات، نظریات اور اپنے نقطہ نظر کا بخوبی اظہار کر سکتا ہے اور لوگوں میں ایک فکر اجاگر کرتا ہے اور اپنا نقطہ نظر ان تک پہنچاتا ہے اور ان کو بھی

دعوت فکر دیتا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب صحافت کی دنیا میں کوئی بھی اخبار کالم کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ کالم نویسی کا سلسلہ دور حاضر میں عروج پر ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کالم نگار آئے روز کالم تحریر کرتے ہیں یہ سلسلہ کالم نویسی تاریخ میں کب شروع ہوا۔ ذیل میں اردو کالم کی روایت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

۴۔ اردو کالم کی روایت

صحافت کا باقاعدہ آغاز برصغیر میں ۱۷۸۰ء میں ہوا۔۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جیمز آگسٹس ہکی نے "ہفت روزہ "، "ہکی گزٹ " یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائز کی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ ہفت روزہ کچھ عرصہ نکلتا رہا پھر اس اخبار کو بند کر دیا گیا۔ انگریز اپنا قبضہ برصغیر پر مضبوط کرنے کے لیے اس سرزمین پر ایسی معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیاں لانا چاہتے تھے کہ جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ اس کے ایسے دیسی وفادار پیدا ہوں جو انہیں اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی زبان رائج کرنے کا خیال بھی برصغیر میں نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی سرکاری زبان بنایا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ طبقہ جو حکمران تھا وہ فارسی زبان کا خاتمہ چاہتا تھا کیونکہ وہ فارسی زبان کو مسلمانوں کے تمدن، علم و ادب اور مغلوں کے اقتدار کی علامت تصور کرتے تھے۔ یوں فارسی زبان کے بجائے اردو زبان کو رائج کرنا سیاسی نوعیت کا فیصلہ تھا یوں فارسی زبان کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ برصغیر کے لوگوں کی زبان بلاشبہ اردو تھی مگر ادب یا صحافت میں اس کو اظہار و خیال کا ذریعہ نہیں جتایا جاتا تھا۔ برصغیر میں اردو کالم کے پس منظر کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو کالم نویسی کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو اخبار نویسی ہے۔ برصغیر کا پہلا اردو اخبار "جام جہاں نما " کے نام سے منظر عام پر نمودار ہوا تھا۔ یہ اخبار ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری کیا گیا۔

برصغیر میں اگر ہم کالم کے ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں کالم کئی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہمیں کالم کی دو حالتیں دکھائی دیتی اول تو یہ خبری کالم تھا یعنی خبروں کو کالم کی شکل میں درج کیا جاتا تھا۔ دوسری صورت میں کالم، کالمی مضامین کی صورت میں سامنے آتے ہیں جس کا آغاز اودھ پنچ نے کیا

تھا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں کالم نے ایک باقاعدہ صورت اختیار کی یعنی اخبارت ورسائل میں باقاعدگی سے کسی مستقل عنوان کے تحت کالم نگار کے نام کے ساتھ شائع ہونے لگے۔ یہ کالم کی وہ صورت تھی جو کہ موجودہ دور میں بھی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کالم نگاری کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کے بعد کالم ہمیں کئی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جسے صحافتی دنیا میں نہایت ہی اہم صنف کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد کی اردو کالم نگاری کی روایت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

۵۔ اردو کالم نویسی کی روایت تاریخ برصغیر کے آئینے میں

تاریخ برصغیر کے آئینے میں اگر اردو کالم نویسی کی روایت کو دیکھا جائے تو کئی محققین نے اپنی تحقیق کے بعد یہ بات باور کرائی کہ اردو کالم نگاری کا سلسلہ اس وقت ہی چل پڑا تھا جب پہلا اردو اخبار منظر عام پر آیا۔ مگر یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ کالم ابتداء میں اردو اخباروں میں اپنی موجودہ صورت میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ دوسری طرف اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو خبریں اردو اخبار کی زینت بنتی تھی وہ اس انداز سے تحریر کی جاتی تھی کہ قاری نہ صرف اس واقعے کے بارے میں جان لیتا تھا بلکہ خبر نویس کی ذاتی رائے اور خیالات بھی اسی کا حصہ ہوتے تھے جو کہ قاری کے لیے دلچسپی کا موجب بھی بنتے تھے۔ برصغیر میں اردو صحافت کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی۔ برصغیر کا پہلا اردو اخبار "جام جہاں نما" تھا جو کہ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب کالم لفظ سے کوئی بھی واقفیت نہ رکھتا تھا اور نہ ہی کالم کی مستقل عنوان کے تحت اپنی کوئی علیحدہ پہچان تھی۔ مگر کالم کا وجود اخبار کی خبروں میں بہر حال ملتا ضرور ہے۔

اردو کے پہلے اخبار کے بارے میں امداد صابری لکھتے ہیں:

> "برصغیر پاک وہند میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی میں "جام جہاں نما" سے ہوا اردو کا یہ پہلا اخبار ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا۔ اس اخبار کا کچھ عرصے تک دو تہائی حصہ فارسی میں اور ایک تہائی اردو میں نکلا۔"(۱۴)

یہ وہ دور تھا کہ پڑھا لکھا طبقہ جس زبان میں مہارت رکھتا تھا وہ فارسی تھی۔ اخبار کو پڑھنے کا ذوق رکھنے والوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس لیے کچھ ہی عرصے بعد یہ اخبار فارسی زبان میں شائع ہونے لگا مگر جلد اس کا اجراء پھر اردو میں کیا گیا۔

اخبار کے ضمن میں ایک اور محقق تحریر کرتے ہیں۔

"اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا جو ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔"(۱۵)

"جام جہاں نما" ایک ایسا اخبار تھا کہ جس کا کچھ حصہ ادب کے لیے مخصوص ہوتا تھا جس میں غزلیں اور نظمیں وغیرہ لکھی ہوتی تھی۔ نثری حصہ، خبروں اور دیگر نوعیت کی تحریروں پر مبنی ہوتا تھا۔ یعنی اردو میں کالم موجودہ کالم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یعنی کے خبروں میں کالم نگاری کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "جام جہاں نما" اردو کالم نگاری کی روایت میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ "جام جہاں نما" کے مدیر منشی سدا سکھ تھے یہ اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے نکلا۔ یہ اخبار ہفت روزہ تھا۔ اس اخبار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اخبار اردو کا نہیں بلکہ فارسی زبان کا پہلا اخبار تھا لیکن موجودہ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ اخبار فارسی کا نہیں بلکہ اردو کا پہلا اخبار ہے۔ اخبار کی انتظامیہ نے جب یہ دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی تعداد اشاعت بہت ہی کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے تو پھر اس اخبار کو اردو کے بجائے فارسی زبان میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

"جام جہاں نما" جو اردو اخبار نویسی کی ابتداء ہے۔ اس اخبار میں جو خبریں سامنے آتی ہیں وہ مختلف نوعیت کی ہوتی تھی جن کو ہم مختلف زمروں میں رکھ سکتے ہیں مثلاً سیاسی خبریں، سائنسی خبریں، تعلیمی خبریں، جرم و سزا کی خبریں، انسانی دلچسپی کی خبریں اور جنگی خبریں وغیرہ۔ موجودہ دور کے اخبارات میں جس طرح سرخیاں لگائی جاتی ہیں اس انداز میں سرخیاں لگائی جاتی تھی بلکہ صورتحال کچھ یوں تھی کہ شہروں کے نام سے خبریں لگائی جاتی تھیں مثلاً لکھنؤ کی خبر، اچنبھے کی خبر وغیرہ۔ "جام جہاں نما" میں خبروں کے علاوہ شعر و ادب اور تاریخ سے متعلق مضامین انگریزی اور فارسی سے ترجمہ کیے جاتے تھے۔ "جام جہاں نما" کی زبان سادہ

پُرکاری کا نمونہ تھی اور اس کا انداز بیان سلجھا ہوا تھا۔ "جام جہاں نما" کی خبروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ بات سامنے آتی ہے اگرچہ باقاعدہ کالم نگاری ہمیں دکھائی نہیں دیتی مگر کالم نگاری کے رنگ ملتے ہیں۔ یہ وہ اخبار تھا جو کہ ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند کر دیا گیا تھا۔

محمد اسلم ڈوگر اس اخبار میں شاہ جہاں آباد کی خبر، کے موضوع سے شائع ہونے والی ایک خبر کا انداز بیان کرتے ہیں:

> "پھول والوں کے میلے کی تقریب سے جب حضرت جہاں پناہ قطب صاحب درگاہ میں رونق افروز ہوتے تھے، اکثر سواری جھولنے پر جاتی تھی۔ حضرت رات سنتے اور زنانے بندوبست میں نہانے کا تماشا دیکھتے۔ خواتین کہیں کہیں خوبی سے آپس میں جھپٹتی لڑکیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے کے پانی میں گر پڑتیاں۔"(۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بظاہر تو یہ اقتباس اردو کے پہلے اخبار۔ "جام جہاں نما" کی خبر ہے۔ مگر اس خبر کی زبان، اسلوب، طرز بیان، عام فہمی، سادہ الفاظ کا استعمال، تحریر کی شگفتگی، خبر نویس کے انداز بیاں سے ظاہر ہوتا ہے یہ کسی کالم کا حصہ تھی۔ یہ وہ پہلا اخبار تھا کہ جس کی خبروں میں کالم کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ خبروں کو اس انداز سے بیان کیا جاتا تھا کہ قاری ایک بار پڑھنے لگتا تو دلچسپی اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اس خبر کو مکمل پڑھ کر ہی قاری دم لیتا۔ خبر نویس ان خبروں میں اپنی رائے کا اظہار کے ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کرتا تھا اور یہ تبصرہ اتنے دلچسپ انداز سے کیا جاتا تھا کہ اخبار پڑھنے والا خبر کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ لکھاری کے انداز تحریر سے بھی لطف اٹھاتا تھا۔ خبر نگاری کا یہ سلسلہ صرف اسی اخبار یعنی۔ "جام جہاں نما" تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اسی دور میں جو دیگر اخبارات نکلتے تھے ان میں خبروں میں کالم کا انداز ملتا ہے۔ مگر اسی اخبار کو اولیت کا درجہ حاصل تھا باقی اخبارات بعد میں آئے اس ضمن میں سہیل انجم لکھتے ہیں:

> "اردو صحافت کی ابتداء "جام جہاں نما" سے ہوتی ہے یہ اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے نکلا۔ اس کے بعد دوسرے اخبارات منظر عام پر آئے۔"(۱۷)

یعنی کہ "جام جہاں نما" کے بعد دیگر اخبارات سامنے آئے اور ان اخبارات میں بھی ہمیں کالم نگاری کا انداز ملتا ہے۔ اور اردو کالم کی جو صورت حال آج کے دور میں ہے وہ دراصل ابتدائی دور کی خبروں ہی سے ارتقاء پذیر ہوئی ہے۔ یعنی وقت کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کی دنیا میں جدت ونُدرت اور نکھار آتا چلا گیا اور آج کالم ارتقاء کے مراحل سے گزر کر اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ صحافتی دنیا میں کالم اب ایک الگ صنف کے طور پر جانا جاتا ہے۔

> "دہلی اردو اخبار یہ وہ دوسرا اردو اخبار ہے جو کہ "جام جہاں نما" کے بعد منظر عام پر آیا اس اخبار کو ۱۸۳۷ء کو دہلی سے شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے "دہلی اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ جو آگے چل کر "دہلی اردو اخبار" بن گیا۔ اردو اخبارات کے متعلق اب تک جو مواد سامنے آیا ہے اس کی روشنی میں "دہلی اردو اخبار" شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اردو اخبار ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق "دہلی اردو اخبار" کا آخری پرچہ ۳۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چھپا تھا۔"(۱۸)

"دہلی اردو اخبار" بھی ہفت روزہ تھا۔ اگر اس اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کو دیکھا جائے تو ان کا انداز بھی تقریباً وہی لگتا ہے جیسا کہ "جام جہاں نما" کی خبروں کا یعنی خبری کالم جسے کہا جا سکتا ہے کیونکہ کالم کی مکمل صورت تو دکھائی نہیں دیتی مگر کالم کے انداز خبروں میں نظر آتا ہے۔ یہ اخبار تعلیم کا زبردست حامی تھا اور تعلیمی اداروں کی خبریں بطور خاص شائع کرتا تھا۔ "دہلی اردو اخبار" میں ادبی مضامین کے علاوہ مختلف شعراء مثلاً غالب اور مومن وغیرہ کی غزلیات کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور نواب زینت محل کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار تقریباً بیس، اکیس سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۸۵۷ء میں بند ہوا۔ جب مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی اور ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ آخری چار برس میں یہ اخبار مولانا محمد حسین آزاد کے سپرد رہا وہی آخری چار برس میں اخبار اور پریس کے پبلشر اور پرنٹر تھے۔

اس اخبار کے بارے میں ڈاکٹر مسکین علی حجازی تحریر کرتے ہیں۔

"یہ ہفتہ وار اخبار۔۔۔ ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء کو اس کا نام "دہلی اردو اخبار" ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں اس اخبار نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جہاد کا فتویٰ بھی شائع کیا۔ چنانچہ حیرت پسندوں کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے گولی مار دی۔"(۱۹)

اردو کے دوسرے اخبار کی خبروں میں کالم کا انداز ملتا ہے۔ خبر نگار خبروں کو اس انداز میں تحریر کرتا تھا کہ جس میں اس کی ذاتی رائے اور تبصرے کا رنگ جھلکتا ہے جو کہ کالم میں بھی بخوبی پایا جاتا ہے لہذا اگر ہم اس اخبار کی خبر کو دیکھیں تو محمد عتیق صدیقی اس اخبار کی خبروں کا نمونہ یوں پیش کرتے ہیں:

"۔۔۔یہ مرزا نوشہ ایک شاعر، نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قربہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت سے کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا عدالت سے جرمانہ علی قدر مرتب ہوا۔۔۔کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت ٹوٹ پھوٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔"(۲۰)

متذکرہ بالا اقتباس "دہلی اردو اخبار" کا ہی حصہ ہے اس خبر میں عام الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے عام فہم انداز میں خبر نویس نے عوام تک خبر کو پہنچایا ہے اور جہاں وہ خبر کو عوام تک پہنچاتا ہے وہیں اس نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے یوں اس نے خبر کو مضمون یا کالم کے رنگ میں تبدیل کر دیا ہے۔ یعنی جس ایماندار تھانے دار کا ذکر اس نے تعریف کے انداز میں کیا ہے وہیں اس تھانے دار کے بہادر پن کو بھی اپنی ذاتی سوچ کے مطابق پیش کیا ہے اور صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مقام اعلیٰ کو ایسے بہادر اور ایماندار سپاہی کی حفاظت

کا مشورہ بھی دے دیا ہے۔ لہذا ان ابتدائی دور کے اخباروں میں کالم نگاری کی جھلکیاں بخوبی ملتی ہیں۔ یہ وہ دور تھا جس کو خبری کالم کا دور کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور کی کالم نگاری اپنے اندر کالم کے پورے خصائص رکھتی ہے۔ تاریخ برصغیر کے آئینے میں کئی اخبارات ایسے ہیں جن میں کالم کے رنگوں کو دیکھا جا سکتا ہے مثلاً اٹھارویں صدی کے ان اخبارات میں سید الاخبار، (۱۸۳۸ء)، کریم الاخبار، (۱۸۴۵ء)، لکھنؤ اخبار، (۱۸۴۷ء)، اعظم الاخبار، (۱۸۴۸ء) وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ پنجاب کی سرزمین کا پہلا اردو اخبار "کوہ نور" تھا جو کہ (۱۸۵۰ء) میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے بارے میں ڈاکٹر مسکین حجازی رقمطراز ہیں۔ "کہ "کوہ نور" پنجاب کا پہلا اخبار تھا۔۔"(۲۱)

"کوہ نور" کو منشی ہر سکھ رائے نے جاری کیا تھا۔ شمالی ہند کا زیادہ ہر دل عزیز اور کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ شروع کے چند برس تو یہ اخبار بہت ہی پسند کیا گیا۔ اس کے خریدار تو بہت تھے یعنی عام عوام کے علاوہ بڑے بڑے انگریز افسر خریدتے تھے۔ کوہ نور اخبار سرکار انگریزی کے زیر سایہ ہی جاری ہوا تھا۔ "کوہ نور" ابتداء میں ہفت روزہ تھا جلد ہی ہفتے میں دو بار نکلنے لگا اور یوں کچھ ہی عرصے میں یہ مقبول ہوا اور پھر ۱۸۸۸ء میں یہ روزنامہ بن گیا۔ یوں یہ سلسلہ جاری و ساری رہا۔ اخبار میں موجود خبروں کو خبری کالم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ اخبار بھی ایسی خبروں کو سامنے لاتا تھا جو کہ موجودہ کالم کے رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ "کوہ نور" ۱۹۰۴ء میں بند کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل دیگر کئی اخبارات اور بھی ہیں جن میں کالم اگرچہ اپنی اصل اور موجودہ شکل میں موجود نہیں ہے مگر کالم نگاری کی خصوصیات اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان اخبارات میں لکھنؤ، مدراس اور آگرہ کی صحافت کے دوران کے اخبارات جو اردو سے متعلق تھے اور جن میں کالم کی خوبیاں نظر آتی ہیں ان اخبارات میں لکھنؤ اخبار، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، مخزن الاخبار، تاج الاخبار وغیرہ شامل تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک اہم اخبار "اودھ اخبار" جو کہ ۱۸۵۸ء میں منشی نول کشور نے جاری کیا، یہ اخبار اپنے دور کا مشہور اخبار تھا چونکہ جنگ آزادی کے بعد حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے اس لیے اب جو اردو اخبار نکل رہے تھے وہ بہت سنبھل کر کام کرتے تھے۔

یہ اخبار ہر لحاظ سے اعلیٰ پائے کا اخبار تھا کیونکہ اس اخبار میں بین الاقوامی خبروں سے متعلق اتنے مضامین تحریر کیے جاتے تھے کہ موجودہ اخبارات میں اس قدر مضامین نہیں چھپتے۔ ''اودھ اخبار'' کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اس نے اردو میں جدید صحافت کے لیے راہ کو ہموار کیا۔ یہ اردو بان کا پہلا روزنامہ تھا جس میں ہر نوعیت کے موضوعات پر تحریر کیا جاتا تھا۔ اس اخبار میں مضامین کی قید نہ تھی معاشی، معاشرتی، اصلاحی، فلاحی، علمی، ادبی غرض ہر قسم کے عنوانات پر مضمون یا مقالے لکھے جاتے تھے۔ جنہیں کالم کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے اور اس اخبار میں ظرافت کے مستقل عنوان سے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کو اولین کالم بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''اودھ اخبار'' اصلاح معاشرہ کا بھی زبردست حامی تھا۔ قومی مسائل پر بحث اسی اخبار میں ملتی ہے۔ اسی اخبار میں ''عبدالحلیم شرر'' نے مضامین لکھے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ اس اخبار کی تعریف سرسید احمد خان نے بھی کی ہے۔ ''اودھ اخبار'' کو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ''اودھ اخبار'' براعظم کی صحافتی تاریک میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس اخبار میں بین الاقوامی اشتہارات بھی قلمبند کیے جاتے تھے کیونکہ یہ اخبار حدود کے اندر رہتے ہوئے آزادی صحافت کا دعوے دار تھا۔ ''اخبار سائنٹیفک سوسائٹی'' جو کہ ۳ مارچ ۱۸۶۶ء کو جاری ہوا جس کے مدیر خود سرسید احمد خان تھے۔ اس اخبار نے بھی اردو صحافت میں نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس اخبار نے صحافت کو آزادی رائے، سنجیدگی، متانت اور بحث ومباحث کی خوبیوں سے نوازا اور باوقار صحافت کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک اور رسالہ جاری کیا جس کا نام ''تہذیب الاخلاق'' تھا۔ تہذیب الاخلاق اور اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں اصلاحی معاشی، سائنسی، معاشرتی، تمدنی، تنقیدی، سماجی، علمی اور دینی مسائل پر مضامین شائع ہوتے تھے یہ مضامین کالم کم مگر اداریے سے زیادہ قریب سمجھے جاسکتے ہیں۔ البتہ ان مضامین میں کالم کے رنگ ملتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومی و ملکی اصلاحی کام کا پہلا آلہ کار یہی رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' تھا۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں

لکھے جانے والے مضامین اس قدر پُر اثر اور دلچسپ ہوتے تھے کہ قاری ان کو پڑھ کر اپنی اصلاح کرتا تھا یعنی یہ مضامین قاری کو متاثر کرتے تھے۔ سر سید احمد کے اخبارات میں چھپنے والے ان کے اور ان کے ہم عصروں کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان مضامین کو ہم ذاتی نوعیت کے کالم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ مضامین اردو کالم نگاری کی جڑیں سینچنے میں بے حد معاون و مددگار ثابت ہوئے کیونکہ دورِ حاضر کے اخبارات میں ایسے کالم شائع ہوتے ہیں جن کا بیان سنجیدہ ہوتا ہے اور حکومتی توجہ اپنی طرف مبذول کروانا ہوتا ہے۔ اردو میں اس قسم کے کالموں کی ابتداء بے شک سر سید احمد خان کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اصلاحی مضامین سے ہوتی ہے لیکن اس کو ہم اردو کالم نگاری کی باقاعدہ ابتداء نہیں کہہ سکتے یہ تو محض ابتداء تھی۔ اس کے بعد مزاحیہ صحافت کا دور شروع ہوتا ہے اور مزاحیہ صحافت کے اس دور کے اخبارات کو عرفِ عام میں پنچ اخبارات کا دور کہا جاتا تھا۔ ان مزاحیہ اخبارات کا راج تقریباً تیس سے بتیس سال تک رہا۔ اس عہد میں نمایاں ترین اخبار "اودھ پنچ" تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں کالم نویسی کے حوالے سے "اودھ پنچ" کے عہد کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اسی اخبار نے ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی، زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ "اودھ پنچ" کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ "اودھ پنچ" کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ جنگ آزادی کے تقریباً بیس برس بعد یہ اخبار منظرِ عام پر آیا۔ اسی بارے میں ڈاکٹر انور سدید "اودھ پنچ" کے بارے میں اپنی کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> "اودھ پنچ" کا اجراء ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔۔۔۔ اس اخبار نے اردو کے متعدد مزاح نگاروں کو روشناس کرایا۔۔۔ "اودھ پنچ" کی غیر معمولی مقبولیت سے متاثر ہو کر متعدد مزاحیہ رسائل منظرِ عام پر آ گئے۔"(۲۲)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات تو وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "اودھ پنچ" کی مقبولیت کے ساتھ ہی ہر طرف پنچ اخبارات کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن پنچ اخباروں میں سر خیل کا درجہ صرف "اودھ پنچ" کو حاصل

ہے۔اسی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اخبار میں طبقہ نہ صرف اس کو اکثریت کے ساتھ پڑھتا تھا بلکہ طنز و مزاح پر مبنی تحریروں کو بہت پسند بھی کیا جاتا تھا۔وہ مزاح نگار جن کا تعلق اردو سے تھا ان میں بے شمار نام ہیں۔ اکبر الہ آبادی، رتن ناتھ سرشار، منشی جوالا پرشاد، تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم ظریف اور نواب سعید محمد آزاد قابل ذکر ہیں۔ "اودھ پنچ" میں خبروں کا سلسلہ مزاحیہ وطنزیہ خبروں کو اخبار بین طبقوں کے لیے دلچسپ بنا کر شائع کیا جاتا تھا۔ تمام تر لکھاری اپنے انوکھے انداز میں مختلف موضوعات پر لکھتے تھے۔اسی اخبار نے اردو طنز و مزاح کی خوب خدمت کی۔ "اودھ پنچ" کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اس اخبار کے لکھاریوں نے اردو زبان کو عام فہم، سادہ اور آسان بنایا، اور اسی اخبار میں موضوعات کا تنوع بھی ملتا ہے۔ کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جو کہ ان لکھاریوں کی زد میں نہ آیا ہو۔ یہ بات تو درست ہے کہ "اودھ پنچ" کے لکھاریوں کی ظرافت بحیثیت مجموعی بے شک معیاری نہ ہو مگر ان تمام لکھاریوں نے ایک بنیاد رکھی اور ایسا ماحول پیدا کیا جس نے اردو میں کالم نگاری کی مزاحیہ روایت کو مضبوط کیا۔ "اودھ پنچ" میں مستقل عنوانات کے تحت لکھاریوں کی مزاحیہ تحریریں چھپتی تھیں۔اس کے مدیر منشی سجاد حسین ہر ہفتے "توکل علیہ رحمتہ علیہ" کے موضوع پر باقاعدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ منشی سجاد حسین کے علاوہ "اودھ پنچ" کے ایک اور لکھاری منشی جوالا پرشاد برق کی تحریریں بھی اسی دور میں شہرت کے بام عروج پر تھیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا مگر ان کا ایک کالم "البرٹ بل" بہت زیادہ مشہور ہوا تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا اس اخبار کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

> "سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھرپور طنز کا آغاز "اودھ پنچ" ہی سے ہوا۔ "اودھ پنچ" سے پہلے محض سرسری نکتہ چینی یا ایک حد تک تنقید ضرور موجود ہوتی تھی لیکن ظرافت کے بیشتر عناصر کا افسوس ناک حد تک فقدان تھا۔"(۲۳)

مندرجہ بالا اقتباس کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس اخبار میں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، ہر قسم کے مضامین پر قلم اٹھایا جاتا تھا۔ "اودھ پنچ" سے قبل تو اخبارات میں نکتہ چینی

یا پھر تنقید کا انداز تو ضرور ملتا ہے۔ مگر اس اخبار نے ظرافت کی کمی کو پورا کیا اور بھرپور انداز میں طنز و مزاح کا سلسلہ جاری و ساری رکھا۔ اسی اخبار نے نہ صرف عوام کے سماجی شعور کو بلند کیا بلکہ سیاسی شعور کو بھی بلند کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ یوں اردو کالم نگاری کی روایت میں "اودھ پنچ" کو سرخیل کی حیثیت حاصل یا پھر یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ اس اخبار کو کالم نویسی کی روایت میں سنگ میل کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا: "یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "اودھ پنچ "کو اس شعبے میں پہلے سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔"(۲۴)

وہ اخبارات جو کہ سنجیدہ خبروں کو شائع کرتے تھے ان اخبارات کے لکھاریوں نے "اودھ پنچ "کو زیادہ پذیرائی نہ دی اور اسی کو نشانہ تنقید بنایا مگر "اودھ پنچ" کی وہ خدمات جو کہ اردو زبان و ادب، طنز و مزاح اور خاص طور پر اردو کالم نگاروں کی جو خدمت کی اس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کالم نگاروں کی روایت جو قیامِ پاکستان سے قبل کی ہے اس میں اس اخبار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اردو صحافت کا سلسلہ جب بیسویں صدی میں پہنچتا ہے تو صحافت اس دور تک کئی حوالے سے ترقی کی منازل طے کر چکی تھی کیونکہ کالم کے ابتدائی رنگ ہمیں کئی اخبارات میں صاف دکھائی دیتے تھے۔ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا سلسلہ جب بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے تو کالم نگاری کی باقاعدہ ابتداء ہو جاتی ہے۔ یہ دور بہت خاص دور تھا کیونکہ یہی وہ دور تھا جس میں باقاعدگی سے کالم کی روایت کو رواج ملا۔

اخبارات میں ایڈیٹر کے علاوہ دوسرے اہل قلم کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں لیکن نہ تو ان میں باقاعدگی تھی اور نہ ہی مستقل موضوعات ہوتے تھے۔ صحافت کی تمام تر اصناف اور اسلوب خبر نگاری کے روپ میں یکجا اور گڈ مڈ ملتی تھی۔ جب خبر واقعاتی حقائق تک محدود ہوئی اور اسے دیگر چیزوں مثلاً رنگ آمیز، رائے زنی اور تبصرہ نگاری کی ملاوٹ سے پاک کیا گیا تو تب جا کر خبر نویسی کے علاوہ دیگر اصناف صحافت اپنی انفرادی خاصیت کے ساتھ منظر عام پر آ گئیں اور اس تبدیلی میں ایک لمبا عرصہ لگا کیونکہ وہ کام جو انیسویں صدی میں ادھورا دکھائی دیتا ہے یعنی وہ اصناف جو اپنی الگ الگ صورت میں انیسویں صدی میں نہ نظر آئیں وہ

بیسویں صدی کے ربع اول میں مدیروں، نامہ نگاروں اور مضمون نگاروں وغیرہ کی تحریریں علیحدہ علیحدہ ان کے ناموں کے ساتھ شائع ہونے لگی۔ اردو صحافت میں مستقل عنوان سے کالم نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال سے ہوتا ہے جو کہ ۱۹۱۲ء میں منظر عام پر آیا۔ "الہلال" کو اردو صحافت میں نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو کالم کا جدید بانی بھی کہا جاتا ہے۔ کالم کا باقاعدہ آغاز انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ہی کیا۔ آپ مستقل عنوان کے تحت لکھتے تھے اور آپ کا کالم تواتر سے آپ کے نام کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اس ضمن میں محمد اسلم ڈوگر تحریر کرتے ہیں:

> "مولانا عبدالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" کو اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ کالم کے جدید انداز کے بانی بھی مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہیں۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ کالم "افکار و حوادث" کے عنوان سے "البلاغ" میں ہی شائع نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے دوسرے جریدے "الہلال" میں بھی شائع ہوتا تھا۔"(۲۵)

مولانا ابو الکلام آزاد نے "افکار و حوادث" کے عنوان سے کالم شروع کیا۔ یہ کالم آپ کے ایک اور جریدے "البلاغ" میں بھی ایک دو بار شائع ہوئے۔ مولانا اپنے کالم پر کبھی اپنا اصل نام اور کبھی قلمی نام "ناصح مشفق" لکھ دیا کرتے تھے۔ کالم میں اہم شخصیات اور برصغیر کے سیاسی حالات و واقعات کو زیر بحث لایا جاتا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے ایک اخبار جاری کی جس کا نام "ستارہ صبح" تھا۔ جس کے صفحہ اول پر مولانا ظفر علی خان کے کالم "مکافات" اور "جواہر ریزے" کے نام سے مستقل عنوانات سے شائع ہوتے تھے۔ ان کالموں میں حالات حاضرہ کو موضوع بنایا جاتا تھا۔

۲۱۔ ۱۹۲۰ء کے عرصہ میں ایک نمایاں کالم نویس کی حیثیت سے مولانا چراغ حسن حسرت مشہور ہوئے۔ کلکتہ کے روزنامہ "نئی دنیا" میں ان کے کالم "سندباد جہازی" کے نام سے شائع ہوتا تھا جو کہ اپنے دور میں بہت مقبول ہوا۔ مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے اس کالم کو لاہور کے بعض اخبارات بھی اکثر نقل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مولانا چراغ حسن حسرت "عصرِ جدید" جو کہ کلکتہ سے نکلتا تھا اس میں بھی "جہاں دگر" کے قلمی نام فکاہی کالم لکھتے رہے۔ ۱۹۳۴ء میں دلی سے خواجہ حسن نظامی کا ہفت روزہ "منادی" شائع ہوتا تھا۔ اس روزنامے میں ان کا کالم "حسن نظامی کا روزنامچہ" کے عنوان سے شائع ہوتا

تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا یہ کالم ایک طرح کی ذاتی ڈائری تھی جس میں وہ حالات حاضرہ پر تبصرہ وغیرہ کرتے تھے اور ساتھ ساتھ اہم شخصیات کے ساتھ ملاقاتوں اور کتابوں وغیرہ کے بارے میں معلومات اور اپنی روزمرہ کی مصروفیات کا بھی ذکر کرتے تھے۔

اردو کالم نگاری کی روایت کو بڑھاتے ہوئے مولانا عبدالمجید سالک نے بھی خدمات سر انجام دی۔ مولانا عبدالمجید سالک کا کالم "افکار و حوادث" تھا جو کہ "زمیندار" لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ یہ بیس سال تک جاری رہا۔ "زمیندار" میں یہ کالم پہلے تو کبھی کبھار شائع ہوا کرتا تھا۔ لیکن ۲۵ فروری ۱۹۲۴ء کو جس وقت اخبار کا سائز بڑھایا گیا تو پھر یہ کالم باقاعدگی سے چھپنے لگا۔ مولانا عبدالمجید سالک مسلسل کئی سال تک یہ کالم قیام پاکستان کے بعد بھی لکھتے رہے۔ "زمیندار" کے بعد یہ کالم "انقلاب" میں شائع ہوتا تھا۔ آپ کے کالم کی مقبولیت سے اردو صحافت میں کالم کی اہمیت اس قدر زیادہ ہو گئی کہ اخبار کا وجود کالم کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا۔ کالم نویسی کی تاریخ میں "افکار و حوادث" نے انقلاب برپا کر دیا۔ جس سے دوسرے متعدد اخبارات میں اسی نوعیت کے کالم دکھائی دینے لگے۔ حتیٰ کہ فکاہی کالم کے بغیر اخبارات کا وجود نامکمل سمجھا جاتا تھا۔

"انقلاب" کے شائع ہونے کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے "زمیندار" سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس علیحدگی کے بعد "زمیندار" میں فکایات کے عنوان سے نیا کالم شائع ہونے لگا جس کے لکھاری مولانا ظفر علی خان تھے۔ مولانا ظفر علی خان چراغ حسن حسرت کو کلکتہ سے لاہور لے کے آئے اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو فکاہات کے عنوان سے جو کالم تحریر کیا جاتا تھا وہ چراغ حسن حسرت کے سپرد کر دیا گیا۔ یوں مولانا چراغ حسن حسرت نے "فکاہات" کا تحریر کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب کام اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔

مولانا محمد علی جوہر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء دلی کے روزنامہ "ہمدرد" میں "کشکول" کے عنوان سے کالم تحریر کرتے رہے۔ یہ کالم کبھی تو ان کے نام کے ساتھ شائع ہوتا تھا اور کبھی نام کے بغیر چھپتا تھا۔ شگفتگی کا عنصر موجود ہوتا تھا مگر اس کالم مزاح اور طنزیہ انداز کی کمی ہوتی تھی جو کہ اس دور میں تمام کالموں کا رواج بن چکا تھا۔ اس کالم کی نمایاں خصوصیت سادگی اور استدلالی انداز تھا۔ ۱۹۳۴ء میں بلال احمد زبیری کی ادارت میں ایک اخبار جاری ہوتا تھا جس کا نام "الجمعیت" تھا۔ کالم نویسی کی روایت میں یہ اخبار بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس

اخبار میں "حوادث و احکام" سے کالم شائع ہوتا تھا۔ اس کالم کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ اس کالم کو ابتدائی دینی کالموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کالم کبھی مولانا کفایت اللہ کے نام سے چھپتا تھا اور کبھی مولانا عظمت اللہ کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے ۱۹۳۵ء میں ایک اور روزنامے میں کالم تحریر کرنا شروع کیا یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا اس روزنامے کا نام "احسان" تھا۔ اس روزنامے میں مولانا چراغ حسن حسرت کے کالم "مطائبات" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا اس کالم نے شہرت کی منازل عبور کی۔ یہ کالم مولانا اپنے قلمی نام "سندباد جہازی" کے نام سے لکھتے تھے۔ اس کے بعد مولانا جب "احسان" سے علیحدہ ہوئے تو روزنامہ "شہباز" سے وابستہ ہوئے تو اس اخبار میں انہوں نے "شہباز" ہی کے عنوان سے کالم لکھنا شروع کیا۔ ان کے کالموں میں ہمیں ندرت اور روانی و برجستگی دکھائی دیتی ہے اسی ضمن میں شفیق جالندھری لکھتے ہیں کہ ":ان کے کالم کی بناوٹ اور تصنع سے پاک اور سلاست و روانی اور بے ساختگی کی عمدہ نظیر ہیں۔"(۲۶)

چراغ حسن حسرت ۱۹۳۷ء میں ہفت روزہ "شیرازہ" میں "اشارات" کے عنوان سے کالم تحریر کرتے رہے۔ یوں کالم نویسی کا سلسلہ گردو پیش میں بھی جاری و ساری ہو گیا ہوا تھا۔ اور تمام تر کالم مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ اسی دور میں سائنسی، علمی، ادبی اور تحقیقی کالم نگاری کا آغاز ہو گیا تھا جس میں مختلف معاملات کے پس منظر کے بارے میں نہیں بلکہ پیش منظر کے بارے میں بھی روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ۳۹۔۱۹۳۸ء کے عشرے کو دیکھا جائے تو اس دور میں بھی فکاہی کالموں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس دور میں مولانا ابو ظفر نازش روزنامہ "سیاست" میں "راز و نیاز" کے عنوان سے کالم تحریر کرتے تھے۔ اسی دور میں حیات اللہ انصاری جو کہ ایک معروف افسانہ نگار تھے وہ لکھنؤ کے اخبار "قومی آواز" میں فکاہی کالم "گلوریاں" کے عنوان سے لکھتے تھے۔ یہ کالم وہ بھاجی کے قلمی نام سے تحریر کرتے تھے یہ کالم نہایت ہی دلچسپ ہوتا تھا اس میں ان کا انداز تحریر شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ بھی تھا۔ اسی طرح حاجی لق لق نے بھی "زمیندار" میں فکاہات کے عنوان سے کالم لکھتے تھے۔ رسالہ ہمایوں لاہور سے جاری ہوتا تھا جس میں حمید نظامی نے کالم نویس کے طور پر شہرت حاصل کی اسی رسالے میں حمید نظامی "جہنم میں" کے عنوان سے کالم لکھتے تھے اس کے بعد انہوں نے

ہفت روزہ "نوائے وقت" میں تخریب شہر کے قلمی نام سے کالم "سخن ہائے گفتنی" جاری کیا۔ اس کالم کو بے حد پسند کیا گیا۔ کالم نگاروں کی دنیا میں مجید لاہوری کا نام بھی اہم ہے انہوں نے روزنامہ "آزادی" میں مطالبات کے عنوان سے کالم لکھے اردو کالم نگاری کی روایت کو تاریخ برصغیر کے آئینے میں دیکھنے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھانے میں کئی قابل قدر نام سامنے آتے ہیں۔ متذکرہ بالا تمام نام ایسے ہیں جنہوں نے اس صنف کے لیے کام کیا۔ یہ وہ اہم نام ہیں جنہوں نے اردو کالم نگاری کی ترقی اور فروغ کے لیے اپنے اپنے حصے کا کام پوری محنت اور لگن سے کیا اور گراں قدر خدمات سر انجام دی۔ متذکرہ تمام اخبارات و رسائل نے اردو کالم نویسی کی روایت کو آگے بڑھانے میں بھرپور کام کیا قیام پاکستان سے قبل اب یہ سلسلہ کالم نویسی بہت واضح ہو چکا تھا کئی اخبارات جو قیام پاکستان سے قبل کام کر رہے تھے انہوں نے بعد میں بھی کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد کالم نویسی کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔

۶۔ اردو کالم نویسی کی روایت تاریخ پاکستان کے آئینے میں

پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آیا۔ صحافت کا سب سے بڑا مرکز پاکستان بننے کے بعد لاہور تھا۔ اردو کالم نگاری اس وقت خوب ترقی کر چکی تھی۔ اردو کالم نگاری اور اردو صحافت نے پاکستان کے وجود کو حاصل کرنے میں نہایت اہم کر دار ادا کیا تھا۔ جس وقت پاکستا ن بنا اس وقت کئی روزنا مے لاہور سے شائع ہوتے تھے چونکہ لاہور قیام پاکستان کے وقت صحافت کا ایک خاص مرکز تھا۔ روزنامہ "زمیندار" روزنامہ "انقلاب" روزنامہ "نوائے وقت"، روزنامہ "آزاد" اور روزنامہ "احسان" لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ وہ اخبارات جو کہ ہندوؤں کے زیر سایہ جاری ہوتے تھے وہ قیام پاکستان کے بعد یا تو بند ہو گئے یا پھر وہ ہندوستان منتقل ہو گئے۔ لاہور کے علاوہ دیگر شہروں مثلاً سیالکوٹ، کراچی اور گوجرانوالہ سے اردو اخبارات کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن ان شہروں کو صحافتی دنیا میں زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ ڈاکٹر مسکین علی حجازی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "پاکستانی پنجاب کے مختلف علاقوں سے ہندوؤں اور سکھوں کے جو اخبارات و جرائد شائع ہوتے تھے وہ یا تو بھارت منتقل ہو گئے یا بند ہو گئے۔"(۲۷)

قیام پاکستان کے بعد ملک پاکستان کو کئی قسم کی معاشرتی و سیاسی تبدیلیوں سے دوبر ہونا پڑا۔ جہاں کبھی جمہوریت اور کبھی آمریت کے تجربوں سے دو چار ہونا پڑا ۔ اس دوران میں صحافت کو بھی کئی طرح کی پابندیوں سے گزرنا پڑا۔۱۹۴۷ءسے لے کر ۱۹۵۸ء تک کا دور ایسا دور تھا جس میں ملک کو مارشل لاء کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اگر اس دور میں صحافت کی دنیا میں ہی کالم نگاری کا جائزہ لیا جائے تو کئی اہم کالم نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے مختلف عنوانات کے تحت کالم تحریر کیے ۔ ان اہم کالم نگاروں میں مولانا عبد المجید سالک ، چراغ حسن حسرت ،حاجی لق لق ، حمید نظامی ، ظہیر کاشمیری ، میاں محمد شفیع ، احمد ندیم قاسمی ، نصر اللہ خان عزیز ، اور سعادت خیالی شامل ہیں ۔ ان تمام کالم نگاروں نے مختلف اخبارات میں کالم مختلف عنوانات کے تحت لکھے ۔ اس دورمیں صحافت مکمل طور پر آزاد تھی ۔ کالم نگار اپنی مرضی سے آزاد فضاؤں میں بغیر خوف کے کالم رقم کرتا تھا۔ یوں کالم کی وہ روایت عمدہ انداز میں سفر کرتی دکھائی دیتی ہے ۔۱۹۵۸ء سے اگر۱۹۶۹ء کے دور میں کالم نگاری کی روایت کو دیکھا جائے تو اس دور میں کالم نگاری زیادہ تسلی بخش دکھائی دیتی ۔ اس دور میں مارشل لاء کی وجہ سے تحریر و تقریر پر پابندیاں لگ گئی یوں کالم نگاروں نے کالم کو علامتی انداز میں تحریر کیا ۔ اس دور کے اہم کالم نگاروں میں شوکت تھانوی،ایس ایم ناز،ابن انشاء،شیر احمد اختر،عبدالقادر حسن،حکیم آفتاب قریشی، قمرانبانوی ، ظہیر بابر، سلیم تابانی، ملا واحدی، احسان بی اے، ابراہیم جلیس اور پیر علی راشدی کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ تمام تر کالم نگار کسی نہ کسی مخصوص عنوان کے تحت کالم لکھتے تھے ۔

جب آہستہ آہستہ ملک کو مارشل لاء سے نکال کر جمہوریت کی طرف لایا گیا تو صحافت کی دنیا میں جو پابندیاں لگی ہوئی تھی وہ قدرے کم ہونے لگی یعنی صحافت آزاد ہونے لگی ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف صحافیوں نے سیاست پر مبنی کالم لکھنے شروع کیے ۔ اس دور کے کالم فکاہیہ اور سنجیدہ ، نوعیت کے تھے ۔ اس دور کے کالموں کے عنوانات کچھ یوں تھے ۔ مثلاً رنگ و آہنگ ، رفتار عالم ، گاہے گاہے باز خواں ، تلخ و شیریں ، مسائل و افکار وغیر وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت کالم تحریر کیے جاتے تھے ۔ اس دورمیں خواتین کالم نگار بھی منظر عام پر دکھائی دیتی ہیں ۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں خواتین نے

بھی اپنے قلم کے جادو دکھائے۔ نزہت اکرام ، امینہ عنبرین، اور سلمی جبین نے روزنامہ "کوہستان "میں کالم تحریر کیے۔اس کے علاوہ رخشندہ حسن اور فرزانہ نظیر نے روزنامہ "امروز "میں کالم لکھے جو کہ انتہائی مقبول ہوئے۔اسی طرح پروین سحر ،نرگس پروین اور نیر عباسی نے روزنامہ "مساوات "جو کہ لاہور سے شائع ہوتا تھا اسی روزنامے میں کالم رقم کیے۔ شمیم اختر ،ش فرخ اور شمیم اکرام الحق معروف خواتین کالم نگار قابل ذکر ہیں۔ متذکرہ تمام تر کالم نگاروں کے کالموں میں جمہوریت ، مسئلہ کشمیر، قومی یکجہتی، صنعتی ترقی ، سماجی اقدار، صوبائی عصبیت اور اخلاقی اقدار جیسے اہم موضوعات کو احاطہ تحریر میں لایا۔۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے دور کو دیکھا جائے تو یہ دو راہم سیاسی حالات و واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ دور جنرل ایوب خان کے استعفی سے لے کر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم ہونے تک کا عرصہ ہے۔وہ اہم واقعات جو اسی عہد میں ہوئے مثلاً مشرقی پاکستان سے علیحدگی ، قادیانیوں کا غیر مسلم قرار دینا، کہوٹہ لیبارٹریز کا قیام ،۱۹۷۳ء کا آئین اور ضیاء الحق کا مارشل لاء نافذ کرنا شامل ہیں۔

صحافت کے لیے یہ دور زیادہ فائدہ مند ثابت نہ ہو سکا کیونکہ اس دور میں کئی اخبارات کو بند کر دیا گیا صرف یہ کہہ کر یہ اخبارات حکومت کے مفادات کے خلاف بات کرتے ہیں۔ بھٹو نے اقتدار میں آتے ہی مارشل لاء کا حکم دیا اور اسی حکم کی پاسداری میں ہی سبھی مقبول عام اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جس کے نتیجے میں زیادہ تر اخبارات نے حکومت کے اس عمل کی شدید مذمت بھی کی۔ یوں صحافت اور حکومت کے درمیان ایک جنگ کی کیفیت بن گئی تھی۔ کئی صحافیوں ، مدیروں اور ناشران طبقہ کے خلاف مقدمے بھی چلائے گئے بلکہ سزاؤں کا بھی مرتکب صحافیوں کو بنایا گیا۔ کہیں اخبارات کا کاغذی کوٹہ کم کیا گیا۔ کہیں اشتہارات پر پابندی عائد کی گئی اور کہیں اخبار کا ڈیکلریشن رد کر دیا گیا۔اسی دور کے اہم ترین کالم نگاروں میں منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، نصر اللہ خان عزیز، بشیر احمد، مسعود احمد، فاروق پراچہ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان کالم نگاروں کے کالموں کے موضوعات سیاسی، معاشی، معاشرتی، طبی، قانونی، نفسیاتی، کھیل اور مذہب وغیرہ کے حوالے سے ہوتے تھے۔ نذیر ناجی، عبدالقادر اشک، عباسی اطہر، ظہیر بابر، ابو الظفر، عطاالحق

قاسمی وغیرہ بھی مخصوص عنوانات کے تحت کالم لکھتے تھے۔ ان تمام کالم نگاروں کے کالم صحافتی دنیا میں بہت دادوصول کرتے تھے۔

سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے بعد کئی لوگ تو پاکستان کے وجود کے متعلق مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن اس دور میں صحافت نے ہی سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا اور کالم نگاری کی دنیا میں اپنے کالموں کے ذریعے سے مایوسی اور عوام کی مایوسی کو دور کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا اور عوام میں حوصلہ و جذبہ بیدار کیا۔ ان اہم کالم نگاروں میں احمد ندیم قاسمی ، ابن انشاء ، ارشاد احمد خان ، ظہور الحسن ڈاراور ابراہیم جلیس کے نام شامل ہیں۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک کے دور کو دیکھا جائے تو مارشل لاء جو کہ ضیاء الحق نے نافذ کیا تھا نہ صرف وہ دور ہے بلکہ فوجی حکومت کا دور ہے ۔ اسی دور میں اور زیادہ سختیاں دیکھنے کو ملتی ہیں کیونکہ اسی دور میں صحافی حضرات کو کوڑے لگانے جیسی ناقابل برداشت سزائیں دی گئیں اور کئی صحافیوں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ یہ وہی دور ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ اس دور میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب اخبارات پر بھی مکمل پری سنسر شپ لگا دیا گیا۔ اخبارات کے متعلق جنرل ضیاء الحق نے یہ تک کہہ دیا کہ اخبارات ملک دشمن سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں اور ساتھ ساتھ عوام کے ذہنوں کو گمراہی کے راستے پر لے جارہے ہیں۔ صحافتی برادری سے کہا گیا کہ جو صحافی قانون کی پابندی نہیں کریں گے تو ایسے پبلشرز اور ایڈیٹرز کو دس سال کی قید بامشقت، جرمانہ یا پھر دس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

اسی دور کے مشہور کالم نگاروں میں انعام الحق درانی، حکیم نور احمد، ظفر اقبال، ارشاد احمد حقانی، ڈاکٹر ریاض الحسن، مولانا کوثر نیازی، فضل حق، زیڈ اے سلہری، مجیب الرحمن شامی، نفیس صدیقی رفیق ڈوگر، میاں شفیع، زاہدہ حنا، جناب عبدالقادر حسن اور ماہر مسعود وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے پابندیوں اور سختیوں کے باوجود کالم نگاری کا سلسلہ نہ چھوڑا اور یہ رسم جو کہ عرصہ دراز سے چلی آرہی تھی اس کو زندہ رکھا۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۹ء کا دور جمہوریت کا دور کہلایا جاسکتا ہے یہ وہ دور ہے جس میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئی۔ اسی سے قبل ملک مارشل لاء جیسے دور سے سفر کر چکا تھا۔ اسی دور میں سازشوں اور الزام تراشی کا

سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ دور زیادہ حوصلہ افزا دور تھا۔ اسی دور کی دو بڑی جماعتوں کے بننے اور ٹوٹنے کے قصے عام ہیں یعنی بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتیں اسی دور میں بنی بھی اور ٹوٹیں بھی۔ ملک اس دور میں شدید نوعیت کے عدم استحکام کا نشانہ بنا۔ سیاست کی دنیا میں ایجنسیوں نے بھی ہاتھ ڈالا اور مداخلت کی۔ جمہوریت کے اسی عہد میں صحافت نے ایک نئی کروٹ لی اور یوں نئے دور کی ابتداء ہوئی۔ تحریر و تقریر پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور سختیوں کا دور اب نرمیوں کے دور میں بدل چکا تھا۔ الیکٹرانک میڈیا کے علاہ اخبارات ورسائل و جرائد کو آزادی حاصل تھی۔ وہ کالم نگار جو اس دور میں شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے ان میں عبد القادر حسن، عباس اطہر، جاوید چودھری، زاہدہ حنا، امجد اسلام امجد، مقبول جان، حسن ظہیر اور رئیس فاطمہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مشفق خواجہ، ارشاد احمد حقانی بھی صحافت کی دنیا میں اپنا نام بنا چکے تھے۔

پروین شاکر روزنامہ جنگ میں "گوشہ چشم" کے زیر عنوان سے کالم لکھتی تھی جو کہ ان کی وفات تک شائع ہوتا رہا۔ اسی طرح حسن نثار، ڈاکٹر انور سدید، عبد القادر حسن، عرفان صدیقی، حامد میر اور عطا الحق قاسمی وغیرہ کے نام بھی ان اہم کالم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اسی عہد میں اخبارات کی دنیا میں کالم جیسی صنف کو پروان چڑھایا۔ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۹ء تک کے عرصہ پر مشتمل کالم نگاروں کے حوالے سے اگر دیکھا تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں آٹھ سال تک وطن عزیز میں آمریت کا تسلط تھا مگر باقی سال جمہوریت کا غلبہ تھا اور اب تک یعنی ۲۰۱۹ء تک بھی جمہوریت ہی قائم ہے اگر ہم اس دور میں صحافتی دنیا پر نظر دوڑائیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ صحافتی برادری یعنی کہ صحافت اس دور میں آزاد ہے یہ وہ دور ہے جس میں کئی نئے اخبارات جہاں منظر عام پر آئے وہیں الیکٹرانک میڈیا نے بھی ترقی کی اور کئی نئے خبروں کے ٹی وی چینلز بھی دیکھنے کو ملے اور اس دور میں بیرونی ممالک کے ٹی وی چینلز کو بھی نشریات کی اجازت دے دی گئی۔

بیرونی ممالک کے ٹی وی چینلز میں CNN, BBC اور CNT وغیرہ شامل ہیں۔ پرائیویٹ ٹی وی چینلز جو کہ پاکستان میں اسی دور میں منظر عام پر آئے ان میں ایکسپریس نیوز، جیو نیوز، اے آر وائے نیوز سماء نیوز اور ایسے ہی کئی دوسرے ٹی وی چینلز ہیں جو کہ اپنے اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں۔ اس دور کے اخبارات میں

امن، آزادی، وقت، پریس کانفرنس، دنیانیوز، خبریہ، پاکستان صحافت، سہارا، جناح، خبریں، اوصاف، نیااخبار، اسلام، اساس، انصاف، اذکار، جسارت، آج، آج کل، چاند، اعتدال، آپ، انتخاب، عوام، نیوز مارٹ، مانند آئینہ، روزنامہ نظام، قوم نیوز، نوائے وقت وغیرہ شامل ہیں۔ تمام تر اخبارات اسی دور میں منظر عام پر آئے۔

اس دور کے اہم کالم نگاروں میں عبد القادر حسن، ڈاکٹر انور سدید، عبد الرشید غازی، اسد اللہ غالب، راحیلہ عشائی، ظفر اقبال، ڈاکٹر شیریں مزاری، سعید قدوائی، مسعود واشعر، اصغر ندیم سید، رؤف کلاسرا، ڈاکٹر شاہد صدیقی، بشر اعجاز، حامد میر، عرفان صدیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر اہم کالم نویسوں میں امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی، رفیق ڈوگر، مجیب الرحمن شامی، نذیر ناجی، ہارون الرشید، مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر محمد یونس بٹ وغیرہ کے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ کالم نگاری کی روایت کا سلسلہ جو کہ قیام پاکستان ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۱۹ء تک جاری رہا یوں یہ سلسلہ یعنی روایت کا یہ بیان ختم ہو گیا ہے۔ جہاں تک کالم کا تعلق ہے تو کالم نگار مختلف قسم کے کالم تحریر کرتے ہیں۔ کالم ایک ایسا فن ہوتا ہے جو خداداد ہے یعنی ہر کالم نویس کے کالم نگار کا اپنا منفرد طرز تحریر ہوتا ہے اسی طرز تحریر کو کلام نگاری کی دنیا میں مختلف اقسام میں تحریر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کالم کو اقسام کے لحاظ سے کئی اقسام میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ ذیل میں کالم کی اقسام پر بحث کی جائے گی۔

۷۔ کالم کی اقسام

کالم نگاری کالم کے لغوی معنی کالم کے صحافتی اور اصطلاحی معنی کے بعد اب کالم کی اقسام پر بحث کی جاتی ہے۔ ہمارے سامنے آئے روز ہزاروں کی تعداد میں کئی کالم اخباروں اور رسالوں کی زینت بنتے ہیں۔ جتنے کالم ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام تر کالم موضوعات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ وہیں ان کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ لکھاری بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بے شمار ایسے موضوعات ہیں جن کو احاطہ تحریر میں لایا جاتا ہے اور

یوں ان مختلف عنوانات پر قلم اٹھانے والے اپنے اپنے مخصوص نرالے ، انوکھے اور منفرد انداز میں لکھتے ہیں۔لہذا اگر اس لحاظ سے اگر کالموں کو دیکھا جائے تو ہمارے سامنے کالم نگاری کی کئی اقسام آتی ہیں لیکن کالم کی کئی اقسام کے حوالے سے محمد اسلم ڈوگر تحریر کرتے ہیں۔

"کالم کی اقسام نہیں بنائی جاسکتی۔ مختلف کالموں کا اسباب ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور موضوع و مواد کے لحاظ سے کسی کالم نگار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔"(۲۸)

ماہر صحافت کی رائے کو اگر سامنے رکھا جائے تو کالم لکھنے کا کوئی مخصوص طریقہ ہے نہ ہی کوئی مخصوص اصول اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کالم نویس پر کوئی خاص پابندی نہیں ہوتی کہ وہ کالم تحریر کرنے کے لیے کون سا اسلوب اختیار کرے ۔ لہٰذا ایک ہی کالم نویس کے کالموں کو کئی اقسام میں آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے کالم کی اقسام کے سلسلے میں مختلف تفصیلات مختلف کتابوں میں بیان کی گئی ہیں جن کا حاصل درج ذیل ہے ۔

۱۔ کالم عام طور پر فکاہی نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں کئی موضوع پر طنز و مزاح کے انداز میں خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ۔

۲۔ کالم کا طرز تحریر شگفتہ ،سادہ اور عام فہم ہوتا ہے ۔

۳۔ کالم معاشرے کے تمام تر پہلو ؤں پر تحریر کیا جاسکتا ہے جس میں ذاتی ڈائری کے علاوہ سیاسی، معاشرتی،طبی ، مذہبی ،نفسیاتی، قانونی، سائنسی ، اقتصادیاتی شامل ہیں۔

۴۔ زیر بحث کالم کی وضاحت اور تشریح بھی کی جا سکتی ہے ۔

۵۔ سنجیدہ کالم بھی ہو سکتا ہے ۔ یعنی یہ قید نہیں کہ کالم نگار صرف طنز و مزاح پر ہی کالم لکھے بلکہ وہ کسی المناک یا افسوسناک واقعے کو اپنے کالم کاموضوع سخن بنا سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا تمام تر نکات سے کالم کی اقسام تلاش کرنے میں کافی مدد مل جاتی ہے ۔ اگرچہ کالم کی اقسام متعین کرنا کوئی آسان کام نہیں اور ویسے بھی صحافت کے اساتذہ اور معروف و مشہور صحافیوں نے بھی اپنے اپنے خیالات کے مطابق مختلف اقسام تجویز کی ہیں ۔ تاہم کالم کی اقسام کو مندرجہ ذیل ترتیب دی جا سکتی ہے ۔

۱۔ موضوعاتی اقسام

۲۔ اسلوبی اقسام

۳۔ مشاہداتی اقسام

ذیل میں ہم مندرجہ بالا تمام اقسام پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں ۔

۱۔ موضوعاتی اقسام

کالم کو موضوع کے اعتبار سے کئی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔یہ کالم کسی خاص پیشے یا مضمون کے حوالے سے لکھے جاتے ہیں ۔یوں کسی خاص مضمون ،کسی خاص پیشے ،کسی خاص شعبے یا پھر کسی خاص مشغلے کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے ۔موضوعات کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے ۔ موضوعات کے اعتبار سے کالموں کو مندرجہ اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے ۔

i. طبی کالم

ii. دینی کالم

iii. قانونی کالم

iv. نفسیاتی کالم

v. اقتصادیاتی کالم

vi. کھیلوں پر مبنی کالم

vii. پامسٹر ی اور علم نجوم پر مبنی کالم

viii. سیاسی کالم

ix. فیشن پر کالم

i. طبی کالم

طبی کالم سے مراد ایسا کالم ہوتا ہے جو کہ کوئی ماہر طب تحریر کرتا ہے ۔ایسے کالموں میں عوام الناس کو مختلف موسمی بیماریوں ، پھلوں اور سبزیوں کے فوائد اور انسانی صحت سے متعلق دیگر مسائل مثلاً دل کی بیماریوں، بلڈ پریشر، موٹاپے ، شوگر اور معدے کے امراض وغیرہ کے متعلق آگاہی فراہم کی جاتی ہے ۔ ایسے کام ایلوپیتھی کے ماہر ہیں ۔ہومیوپیتھی کے ماہر ہین اور طب یونان کے ماہر ہیں اپنے اپنے ایک خاص طرز سے تحریر کر کے عوام الناس اور مختلف نوعیت کے مسائل پر آگاہی دیتے ہیں ۔ طبی کالم کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں ۔

> " طبی کالم کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ بیماریوں کی روک تھام کے طریقوں سے واقف ہو جائیں ۔ ایسی غذائیں استعمال کریں جن سے بیماریوں کا امکان کم رہ جائے ۔ نیز انھیں معلوم ہو کہ کس مزاج کے افراد کے لیے کون سی چیز مفید ہے اور کون سی مضر ۔"(۲۹)

طبی کالم نگاری کا بنیا دی کام صحت کے معاملے میں قارئین کی راہنمائی کرتا ہے ۔ انہیں بیماریوں سے بچنے کی تراکیب بتانی ہوتی ہیں ۔ اور اگر کوئی بیماری لگ جائے تو اس بیماری کے علاج کے لیے مفید اور کارآمد مشورے دینا ہوتے ہیں ۔پھلوں اور سبزیوں کے خواص اور ان کے استعمال کے

طریقوں کے علاوہ مختلف موسموں کے اثرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر کو کالم کا موضوع بنایا جا سکتا ہے ۔ طبی کالم ڈاکٹر کا متبادل نہیں ہو سکتا ۔

ii. دینی کالم

دینی کالم میں قرآن و احادیث اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔یہ کالم عموماً علماء کرام اور دینی علوم پر دسترس رکھنے والے افراد تحریر کرتے ہیں ۔اخبارات میں دینی کالم خاصے اہتمام سے شائع کیے جاتے ہیں ۔ایسے کالموں میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ اسلامی تہواروں اور مذہبی شخصیات کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ قاری تک پہنچایا جا تا ہے ۔دینی کالم تحریر کرنے والے زبان و بیان پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں ۔عوام کاعلم دراصل اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ وہ قرآنی علوم ،فقہ اوراحادیث کی کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔لہٰذا یہ دینی کالم عوام الناس کی راہنمائی کا اہم ذریعہ ہیں ۔کالم بے شک ذاتی خیالات وتصورات کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن دینی کالم کو استثنیٰ حاصل نہیں ہوتا ۔ ایسے کالم میں کالم تحریر کرنے والے اپنی رائے کا اظہار تو بخوبی کر سکتا ہے مگر اپنی ذاتی رائے کو فیصلہ بنا کر پیش نہیں کر سکتا ۔لہذا دینی کالم لکھتے وقت متذکرہ بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے ۔

iii. قانونی کالم

قانونی کالم کو ماہر قانون ہی تحریر کرتے ہیں ۔ ملکی قوانین سے آگاہی کے لیے کالم اہمیت کا درجہ رکھتے ہیں تمام لوگ قانون سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے لہذا قانونی کالم عوام الناس کی راہنمائی کا ایک وسیلہ ہوتے ہیں۔ جن میں ایک ماہر قانون عوام کو مختلف مسائل اور معاملات کے بارے میں قانونی راہنمائی کرتا ہے ۔ پاکستان کے بڑے اخبارات اور ہفت روزوں میں ایسے کالم شائع ہو رہے ہیں ۔قانونی کالموں میں ملکی قوانین کی عام فہم اور سادہ زبان میں وضاحت کی جاتی ہے اور ساتھ ہی

ساتھ عام آدمی کی دلچسپی کے قانونی امور واضح کیے جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ قانونی کالم میں جذباتیت یا پھر مبالغہ آرائی کی ہر گز گنجائش نہیں ہوتی ۔

iv. نفسیاتی کالم

اس کالم میں انسانی نفسیات اور مختلف نفسیاتی مسائل پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے ۔ انسان کی مختلف نفسیاتی مسائل پر ایک ماہر نفسیات ایسے کالم تحریر کرتا ہے ۔ مسائل کے حل کے لیے ماہرانہ مشورے دیے جاتے ہیں۔اس کالم کے بارے میں محمد اسلم ڈوگر رقمطراز ہیں ۔

> " نفسیاتی کالم کی زبان عام فہم ہونی چاہیے ۔ تاہم اس امر کا تعین کرنا ضروری ہوتا ہے کہ نفسیاتی کالم متعلقہ قارئین کی نفسیات کے مطابق ہو ۔"(۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نفسیاتی کالم کی زبان عام فہم ہو جو باآسانی قارئین کو بھی سمجھ آ جائے اور کالم کو ایسا ہونا چاہیے جو کہ قارئین کی نفسیات سے متعلق ہو تاکہ یہ کالم قارئین پر مثبت اثرات مرتب کرے ۔ ایسی زبان کا استعمال نہ کیا جائے جس سے قاری ابہام کا شکار ہو۔

v. اقتصادیاتی کالم

اقتصادیاتی کالم مخصوص قارئین کے لیے وقف ہے جس میں اقتصادی صورتحال اور ملکی بجٹ کا تجزیہ اقتصادی ماہرین کرتے ہیں اور مفید مشوروں سے حکومت کو نوازتے ہیں ۔ یہ کالم حکومتوں کے لیے مالیاتی شعبے میں راہنمائی کا کام سر انجام دیتے ہیں۔ چونکہ ملکی معیشت میں ہونے والی تبدیلیاں عام آدمی کو متاثر کرتی ہیں اس لیے عام عوام کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مختلف اشیاء کی قیمتوں میں ہونے والے اضافے یا کمی کے بارے میں علم رکھیں ۔ یوں ایک قاری کی اسی نوعیت کی ضرورت کو اقتصادی کالم ہی پوری کرتے ہیں ۔ اس کالم کا مقصد بھی صرف یہی ہوتا ہے کہ قارئین اقتصادی شعبہ جات کے متعلق راہنمائی حاصل کر سکیں ۔

vi. کھیلوں پر مبنی کالم

اخبارات میں کھیلوں سے متعلق کالم باقاعدگی سے شائع کیے جاتے ہیں یہ کالم اگرچہ روزانہ شائع نہیں ہوتے مگر ہفتے میں ایک بار ضرور شائع ہوتے ہیں جو کہ ہفتہ بھر کے کھیلوں کی اہم خبروں، تبصروں اور کھلاڑیوں کے انٹرویوز پر مبنی ہوتے ہیں ۔پاکستان کے تقریباً تمام اخبارات باقاعدگی سے کھیلوں کے حوالے سے کالم شائع کرتے رہتے ہیں۔ جنہیں لوگ بڑے زوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور کھیلوں کی دنیا سے آشنا رہتے ہیں ۔کھیلوں کے کالم کا اہم ترین مقصد عوام کو تفریح مہیا کرنا ہوتا ہے ۔اس کے علاوہ ان کالموں کے ذریعے نوجوان نسل کھیلوں کی دنیا کے قریب ہوتی جاتی ہے۔یوں عوام ان کھیلوں پر مبنی کالموں کے ذریعے سے کھیلوں پر مبنی معلومات کو آسانی سے جان لیتے ہیں ۔

vii. پامسٹری اور علم نجوم

پامسٹری اور علم نجوم سے متعلق کالم بھی قارئین میں بے حد مقبول ہیں اور اخبارات میں دست شناسی اور علم نجوم کے حوالے سے بڑے اہتمام کے ساتھ کالم چھپتے ہیں ۔ اس قسم کے کالم میں دست شناسی اور ستاروں کے اثرات کے بارے میں عام دلچسپی کی باتیں شامل کی جاتی ہیں ۔ قارئین کے وہ سوالات جن کا تعلق دست شناسی سے ہوتا ہے ان کے جوابات فراہم کیے جاتے ہیں ۔ کالم میں ہاتھ کی لکیروں کے متعلق جہاں معلومات فراہم کی جاتی ہیں وہیں دوسری طرف ستاروں کی گردش سے ہماری زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کے حوالے سے پورے ہفتے میں ہونے والے واقعات کے بارے میں پیشن گوئی کی جاتی ہے ۔قارئین ان کالموں کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں دن بدن ان کالموں کی اشاعت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔پاکستان بھر سے شائع ہونے والے اخبارات میں یہ کالم شائع ہوتے ہیں جو کہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوتے ہیں ۔ان کالموں سے اکثر عوام میں غلط قسم کی توقعات یعنی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی تو خوش فہمیوں میں یہ

کالم عوام کومبتلا کر دیتے ہیں ۔اخبارات اور رسائل میں "ستارے کیاہیں؟"، "آپ اورآپ کی قسمت"، "ہاتھ کی لکیریں "،اور اسی نوعیت کے دوسرے عنوانات کے تحت کالم شائع ہوتے ہیں ۔

viii. سیاسی کالم

سیاسی کالموں میں سیاست پر مبنی باتیں کی جاتی ہیں ۔ ان کالموں کے ذریعے سیاسی معاملات سے عوام الناس کو آگاہ رکھا جا تا ہے ۔ ان کالموں میں ملکی اور بین الاقوامی سیاست کا حال احوال بتایا جاتا ہے۔ سیاسی شخصیات کے بارے میں ایسے کالموں میں تحریر کیا جاتا ہے اس کے علاوہ حکومتی سطح پر ہونے والے سیاسی معاملات کے تنازعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے ۔

ix. فیشن پر کالم

اخبارات میں خاص طور پر خواتین کے جرائد میں فیشن کے موضوع پر باقاعدگی سے کالم شائع کیے جاتے ہیں۔اس نوعیت کے کالم میں جو زیادہ تر خواتین لکھتی ہیں ۔ ملبوسات ،فرنیچر،تزئین و آرائش،ہیر سٹائل اور فیشن کے حوالے سے معلومات ،آراء اور تجاویز فراہم کی جاتی ہیں اورایسے کالم خواتین کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ خواتین کے علاوہ مرد بھی فیشن پر مبنی کالم لکھتے ہیں۔فیشن پر مبنی کالم قارئین میں کافی مقبول ہیں اخبارات اور رسائل و جرائد میں فیشن پر تصویروں کے ساتھ مضامین بھی شائع ہوتے ہیں ۔ اس کالم کا اہم اور بنیادی کا م یہ ہوتا ہے کہ یہ خواتین کو زیادہ خوبصورت اور حسین بننے کے لیے ماہرانہ مشورے فراہم کرتا ہے ۔

۲۔ اسلوبی اقسام

اسلوب کے اعتبار سے کالم کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

i. فکاہی/مزاحیہ کالم

اردو صحافت میں کالم نویسی کی ابتداءفکاہیہ کالموں سے ہوئی ہے۔ موجودہ دور میں فکاہی کالم اپنی اہمیت اور مقبولیت کے اعتبار سے سرفہرست ہیں اور ان کالموں کے قارئین کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے ۔ ایسے کالموں میں طنز و مزاح ہوتا ہے ۔ انہیں دلچسپ بنانے کے لیے زبان و بیان کی چاشنی ، لطیفہ گوئی ، چٹکلوں ، پیروڈی اور قارئین کے لیے تفریح طبع کا خیال رکھنے پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے ۔ فکاہی کالم لکھنے والے زبان و بیان پر مکمل دسترس رکھتے ہیں کہ روزنامہ "نوائے وقت"کا کالم "سر راہے"روزنامہ "امروز "کا کالم "حرف و حکایت"، روزنامہ "مشرق "کا کالم "آج کی باتیں"، ہفت روزہ اخبار"خواتین"کا کالم" آپ سے کیا پردہ " وغیرہ فکاہی کالموں کی مثالیں ہیں ۔

ii. سنجیدہ کالم

سنجیدہ کالموں میں زندگی اور معاشرے کے سنجیدہ پہلوؤں کو موضوع بنایا جاتا ہے ۔ ان کالموں میں طنزومزاح کی گنجائش نہیں ہوتی اور کالم نگار سنجیدگی سے غور وفکر کا انداز اپناتاہے اور معلوماتی مواد فراہم کرتا ہے۔سنجیدہ کالم نویسی کرنے والوں میں چند اہم نام حامد میر ، جاوید چوہدری اور عرفان صدیقی وغیرہ شامل ہیں ۔سنجیدہ کالم نگار معاشرے کے مسائل اور حالات و واقعات کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں ۔

iii. اقتباسی کالم

اقتباسی کالم میں خبروں ، واقعات اور بیانات کو ہو بہو (من و عن)پیش کیا جات ہے ۔ اس نوعیت کے کالم میں مختلف شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز ، اور اقوال وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں اس کے علاوہ دوسری زبانوں کے ترجمے ، مختلف شعراء کی نظمیں اور غزلیں وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں ۔

iv. ترکیبی کالم

ترکیبی کالم میں موضوع پر اظہار خیال کے لیے مختلف ترکیبی انداز اختیار کیے جاتے ہیں ۔ عام طور پر کسی تازہ اہم یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دلچسپی کے حامل واقعہ کو اظہار خیال کا مرکزی نقطہ

بنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی کالم کا آغاز کسی لطیفے یا چٹکلے سے کیا جا تا ہے ۔ بعض کالموں کا اختتام کسی المیے کے حوالے سے ہوتا ہے ۔ بعض اوقات کالم کا آغاز اور اختتام زوردار ہوتا ہے ۔ جبکہ نفس مضمون ڈھیلا ڈھالا رہ جاتا ہے ۔ بعض کالموں کا ابتدائیہ اور اختتامیہ پرکشش نہیں ہوتا ۔ البتہ نفس مضمون زیادہ توجہ طلب اور جاندار ہوتا ہے ۔اس قسم کے کالم روائتی انداز میں نہیں لکھے جاتے ۔

v. مکتوباتی کالم

مکتوباتی کالم جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے کالم قارئین کے خطوط کے ذریعے ترتیب دیے جاتے ہیں ۔ کالم نگار ان خطوط کے حوالے سے مندرجات پر اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کالم نگار خطوط کو سیاق و سباق کے ساتھ اسی طریقے سے ترتیب دیتا ہے کہ وہ اپنی رائے کی شمولیت کو ضروری نہیں تصور کرتا اور قاری خودبخود ہی مطلوبہ معانی اخذ کر لیتے ہیں ۔

vi. علامتی کالم

علامتی کالم میں علامتی طرز تحریر اپنا یا جاتا ہے ۔پا بندیٔ صحافت کے دور میں عام طور پر علامتی زبان اختیار کی جاتی ہے ۔ایسے دور میں کالم نگار علامتوں کا سہارا لیتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کو عوام تک پہنچاتے ہیں۔پابندیوں کے دور میں کالم نگار اور دیگر اہل قلم علامتی انداز تحریر کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ ادیب یا صحافی براہ راست یا کھل کرحقائق بیان کرنے سے گھبراتے ہیں۔یوں کالم نگار اشاروں ،کنایوں، استعاروں اور محاوروں وغیرہ کا استعمال کر کے اپنی بات کو قارئین تک پہنچاتے ہیں مارشل لاء کے دور میں عام طور پر جو کالم تحریر کیے جاتے ہیں ان کا طرز تحریر علامتی ہوتا ہے ۔

۳۔ مشاہداتی اقسام

مشاہدے کے لحاظ سے کالم کو مزید دو اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے مشاہداتی کالم کو اردو صحافت میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔

i. سیاحتی کالم

ایسے کالم میں سیاحت ، تفریح ، سنسر اور مہم جوئی وغیرہ کے حوالے سے روداد قلمبند کی جاتی ہے ۔ مباحثی کالم کہلاتے ہیں ۔اندرون ملک یا بیرون ملک کے دورے ، قومی اور بین الاقوامی سطح کے اجتماعات مثلاً سیمینار ، مذاکرہ ، ورکشاپ کانفرنس اور تعلیمی و تربیتی کورس کی روداد وغیرہ سیاحتی کالم میں بیان کی جاتی ہے ۔

ii. ڈائری نما کالم

یہ کام بھی مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے۔اسی کالم کو ہم شہر نامہ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں کالم نگار مختلف حالات و واقعات کو اپنے ذاتی تاثرات کے ساتھ وضاحتی انداز میں بیان کرتا ہے اور ان کالموں میں مشاہداتی مواد زیادہ ہونے کی صورت میں ایک ہی کالم کئی روز تک جاری رکھا جاسکتا ہے۔

ج: ڈاکٹر شاہد صدیقی:تعارف

ڈاکٹر شاہد صدیقی وہ ستارہ ہیں جو ۱۹۵۷ء میں راولپنڈی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز مریر حسن کے ایک اسکول سے کیا جبکہ پرائمری کا امتحان لال کرتی کے سکول سے پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان سی ۔ بی ٹیکنیکل اسکول طارق آباد(لال کُرتی) سے پاس کیا ۔ پھر انہوں نے کالج میں داخلہ لیا ۔ ایم۔اے کی ڈگری انہوں نے"گورڈن کالج"سے حاصل کی ۔بعد ازاں برٹش کونسل کی اسکالر شپ پر برطانیہ کی یونیورسٹی آف مانچسٹر سے (ME TESOL) کی ڈگری حاصل کی ۔ پی ۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے وہ کینڈین کا من ویلتھ اسکالر شپ پر یونیورسٹی آف ٹورنٹو گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۹۵ء میں پی ۔ایچ ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ کھیل کود بچپن کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں ۔موصوف کو کرکٹ سے بڑا شغف تھا ۔ وہ چھٹی کے دن کرکٹ کھیلنے جایا کرتے تھے یوں ان کی چھٹی کا دن کھیل کود میں گزر جاتاتھا ۔ آپ کے والد اور والدہ دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ کے والد نہ تو معروف معنوں میں سکول اور کالج

سے تعلیم یافتہ تھے نہ ہی کوئی سرکاری نوکری کرتے تھے ۔ البتہ و ہ دینی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ کے والد فارسی، اردو ، عربی اور پنجابی زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اردو ، فارسی اور پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے ۔ آپ ۱۹۸۵ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے ۔ آپ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں ۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کی ادب سے دلچسپی ان کے بچپن ہی سے نظر آتی ہے کیونکہ ان کو صرف کھیل کود سے ہی لگاؤ نہ تھا بلکہ بچپن ہی سے نمایاں ادبی رسائل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے تھے ۔ اس زمانے کے معروف ادبی رسائل "ادبی دنیا "اور"نقوش "سے ان کی شناسائی تھی ۔ رسائل کے ساتھ ساتھ وہ معروف کلاسیکی ادب پاروں کا بھی مطالعہ کرتے تھے ۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں ہی "فردوس بریں "اور "باغ و بہار"جیسی کتابیں پڑھ لی تھیں ۔ادب کی طرف بڑھتی ہو ئی دلچسپی کی بڑی وجہ ان کے گھر کا ماحول تھا ۔ ان کے والد اور والدہ کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا ۔ان کے گھر کی لائبریری میں مختلف نوع کی کتابیں موجود تھیں۔ والدین نے ان کے لیے زیادہ سے زیادہ تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا ۔آپ کے بڑے بھائی نے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی ۔گویا کتب بینی اور ادب شناسی ڈاکٹر شاہد صدیقی کو ورثے میں ملی ۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی جہاں بھی گئے انہوں نے علم و ادب کی شمع کو فروزاں کیا چونکہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کا تعلیمی پس منظر انگریزی کا ہے لیکن اردو سے گہر ی دلچسپی رکھتے تھے اس کا منھ بولتا ثبوت آپ کا تحریر کردہ ناول "آدھے ادھورے خواب" ہے ۔آصف فرخی اسی ناول کے بارے میں کہتے ہیں کہ :"اخباری مضمون سے بڑھ کر شاہد صدیقی کا قائل تو میں اسی ناول سے ہوا۔" (۳۱)

آپ کی زیادہ کتابیں انگریزی میں ہیں ۔صرف یہی ایک ناول اردو میں تحریر کیا ہے ۔ اس ناول کو تین پبلشرز نے شائع کیا ہے او راس کا پنجابی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے ۔اردو نثر سے انہیں گہری دلچسپی ہے اور ان کا یہ ماننا ہے کہ یہ نثر بھاری بھرکم الفاظ کے بجائے سادہ الفاظ میں ہونی

چاہیے ۔ڈاکٹر شاہد صدیقی مختلف اداروں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے گورنمنٹ کالج منڈی بہاؤالدین سے بطور لیکچرار عملی زندگی کا آغاز کیا ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۹۹۴ء تک علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی خدمات سر انجام دیتے رہے ۔ بعدازاں آغا خان یونیورسٹی آف مینجمینٹ سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی جیسے اداروں سے جڑے رہے ۔ سب سے زیادہ تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے آپ کا کام "لاہور اسکول آف اکنامکس" کے قیام کے دوران سامنے آیا۔علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو جدید دور سے ہم آہنگ کرنے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ۔ ایک مرتبہ پھر آپ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں بطور وائس چانسلرچار سال (۲۰۱۸ء۔۲۰۱۴ء)تک کام کرتے رہےاور اس دوران آپ کی کاوشوں سے یونیورسٹی علمی و ادبی، تحقیقی او رسماجی سرگرمیوں کا مرکز بنی ۔یوں آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہے ۔آج کل آپ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ڈین کے طور پر اپنی خدمات سر انجام دے رہے تھے ۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کی تعلیمی خدمات کے سلسلے میں آپ کو بے شمار اعزازات سے نوازا گیا ۔ جن میں اہم کورین برٹش کونسل ایوارڈ (مانچسٹر)یو ایس ایمبیسی اسکالر شپ (ورمونٹ)، کینڈین کامن ویلتھ ایوارڈ (ٹورنٹو)، چارس ایوارڈ (آکسفورڈ)، سوشل سائنسز ریسرچ کونسل ایوارڈ (سری لنکا)، اور ایم ٹی سی بی ایوارڈ (ملائیشیا)سر فہرست ہیں ۔بطور کالم نگار ڈاکٹر شاہد صدیقی کا ایک نام ہے ۔ان کا ادبی ذوق ان کی کالم نگاری میں بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے کالم نگاری کا سلسلہ انہو ں نے ۲۰۰۰ء میں انگریزی اخبار "دی نیشن" سے شروع کیا۔ "دی نیشن" کے بعد "ڈان"اور پھر "دی نیوز"میں باقاعدگی سے انگریزی زبان میں کالم لکھتے رہے مگر اردو کالم نگاری کا آغاز انہوں نے ۲۰۱۷ء میں کیا کیونکہ ان کو ایسا لگتا ہے کہ کالم کے ذریعے ہم اپنا نکتہ نظر دوسروں تک آسانی سے پہنچا سکتے ہیں ۔ ان کے اردو کالم "زیر آسمان" کے عنوان سے روزنامہ "دنیا"میں ہفتہ وار چھپتے ہیں ۔ ان کے مطابق ہر کالم میں قاری کو کچھ نیا پن ملے لہذا ہر کالم تحریر کرنےسےپہلے موضوع کے حوالے سے تحقیق

کرنا ضروری ہوتی ہے ۔ ان کے کالموں میں معلومات کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ بھی شامل ہوتے ہیں۔کالم نگاری کی تحقیق کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ بہت سے تاریخی مقامات جن پر انہوں نے کالم لکھے وہاں وہ خود گئے اور وہاں کے گردوپیش کو محسوس کیا اور پھر ان کے بارے میں لکھا۔ جن جگہوں پر وہ خود نہیں جا سکے ان کے بارے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی مختلف کتابوں ، رسالوں اور لوگوں سے معلومات اکٹھا کیں۔ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اردو کالم ہی مجوزہ تحقیق کا موضوع ہیں ۔ ان کے اردو کالم کی ابتداء۲۰۱۷ء سے ہوتی ہے لہذا ۲۰۱۷ء سے لے کر مارچ ۲۰۱۸ء تک کے اردو کالم ہمارا موضوع تحقیق ہوں گے ۔ ان کے کالموں کا فنی جائزہ آنے والے ابواب میں لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ سید اقبال قادری ، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء ص ۳۱۷

۲۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، کالم کلامیاں، ادارہ علم و فن، پاکستان، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

۳۔ وارث سرہندی، ایم اے، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۰۰

۴۔ Qomi English Urdu Dictionary, Edited by Dr. Jameel Jalbi, 2013, Page 329

۵۔ Little oxford English Dictionary ,Edited by Sara Hawker, oxford University press, New York, 2006, A.D, Page 127

۶۔ نور اسلام ندوی، رہنمائے صحافت، نوشاد عالم (پرنٹ میڈیا) پٹنہ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۱

۷۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۹

۸۔ نور اسلام ندوی، رہنمائے صحافت، ص ۱۹۱

۹۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، ص ۱۲۰

۱۰۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، ص ۱۲۷

۱۱۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاکستان و ہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص ۱۲۳

۱۲۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱

۱۳۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے ون پبلیشرز، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۲

۱۴۔ مولانا احمد صابری، روح صحافت، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳

۱۵۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۲

۱۶۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، ۱۹۹۸ء، ص ۸۰۔۸۱

۱۷۔ سہیل انجم، احوال صحافت، ذاکر نگر، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء، ص ۲۵

۱۹۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۱

۲۰۔ محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)، پبلی کیشنز مزید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۰ء، ص ۴۷۔۷۳

۲۱۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۱

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ۱۹۹۲ء، ص ۳۷

۲۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۰۔۳۱۹

۲۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۵

۲۵۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، ۱۹۹۸ء، ص ۹۵۔۹۴

۲۶۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، اردو کالم نویسی، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۶

۲۷۔ مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت، ص ۴۹۷

۲۸۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸

۲۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، کاروان پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۹

۳۰۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴

۳۱۔ آصف فرخی، تعارف، مشمولہ: آدھے ادھورے خواب، مصنف: شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۵

باب دوم:

شاہد صدیقی کے کالموں کے فنی لوازمات کا تجزیاتی مطالعہ

الف: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا فنی مطالعہ:

ڈاکٹر شاہد صدیقی معاصر ادباء میں ایک قد آور نام ہے۔ وہ کئی حوالوں سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی نگہداشت و پرداخت بھی ادب کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ ان کے کالموں میں ادب کی مختلف حیات کے رنگ نمایاں ہیں۔ ادب میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحات اور اظہار کے تمام طریقوں کو انہوں نے اپنے کالموں میں برتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کالم صحافتی دنیا سے نکل کر ادب کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کالموں میں گہرا مشاہدہ ملتا ہے پھر وہ ادب کی مختلف تکنیکوں کو اپنے کالم میں استعمال کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اپنے لیے نئے سانچے بھی تراشتے ہیں۔ ان کے ہاں کہانی پن بھی نمایاں نظر آتا ہے وہ بات کو الجھاتے نہیں بلکہ تسلسل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

کالم چونکہ زیادہ لمبی چوڑی تقاریر اور بحثوں کا متحمل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں کوزے میں دریا کو بند کرنے کی صفت نمایاں نظر آتی ہے۔ منظر کے مطابق خوبصورت زبان و بیان کا استعمال ان کے کالموں کو اور بھی دلکش بنا دیتا ہے۔ اسی باب میں ان کے کالموں کے اندر پائے جانے والے ادبی لوازمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ذیل میں نکات کی شکل میں یہ جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ بیانیہ انداز

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں بیانیہ انداز کو اپنایا ہے۔ یعنی کہانی کے انداز میں انہوں نے بعض واقعات کو بیان کیا ہے۔ اس بیانیہ انداز میں ایک خاص تسلسل ہے۔ حرف سے حرف جملے سے جملہ اسی طرح پیوست ہے جیسے زنجیر کی کڑیاں آپس میں مضبوطی سے جڑی ہوتی ہے اور ہر حصے کی اہمیت نمایاں ہے۔ ان کے کالموں میں ہمیں بیانیہ انداز کی جھلک تقریباً ہر صفحے پر نمایاں نظر آتی ہے۔

زندگی کے ابتدائی دنوں کی کہانیوں کو بھی وہ خوبصورت رنگ دے کر بیان کرتے ہیں:

" اسی سلسلے میں مجھے سکول کا دورہ یاد آ رہا ہے۔ یہ لڑکیوں کے سکول میں چوتھی جماعت کی کلاس تھی۔ سکول والوں کو ہمارے دورے کا پہلے سے علم تھا۔ میں کلاس کے آخر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔"(۱)

ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنی روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ واقعات کو بیانیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بچپن کے حالات ہوں یا آج کل کے تجربات ہر جگہ اپنے قلم کے جوہر بکھیرتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں بھی ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ایک سکول کے دورے پر گئے ہیں۔ چونکہ ماہر تعلیم ہونے کے ناطے سے ان کا واسطہ سکولز، کالجز اور جامعات سے رہتا ہے۔

ایسے ہی ایک دورے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے مشاہدات کو مذکورہ کالم میں بیان کیا ہے۔ وہ اچانک مشاہدے کی غرض سے مختلف اداروں کا دورا کرتے ہیں اور آج بھی ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے ایک سکول کا دورہ کیا اور وہاں پر پیش آنے والے آمدہ تجربات کو انہوں نے بیانیہ انداز میں اپنے کالم میں برتا ہے۔ سکولوں میں بچوں کو دی جانے والی سزا پر وہ تنقید کرتے ہیں۔

دراصل ہمارے ملک میں بعض اوقات ایسی سزائیں دی جاتی ہیں جو بچوں کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب کرتیں ہیں۔ اس دورے کے دوران بھی انہوں نے دیکھا کہ اسکول کے ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا "نالائق بچے" اس طرح انہوں نے ایک اہم مسئلے کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے کہ ہم بچے کو نفسیاتی لحاظ سے اور کمزور کر دیتے ہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے بچے کے اندر خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ تجربات کو سبق آموز بنا کر ڈاکٹر شاہد صدیقی نے کہانی کا رنگ دے کر بیان کیا ہے جو کالم پڑھنے پر قاری کو اُکساتا ہے۔

روزمرہ کے تجربات کو اپنے انداز میں ڈھال کر پیش کرنا ایک فن کار کی علامت ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ان کی فنی چابکدستی ملاحظہ فرمائیں:

"کچھ عرصہ پیشتر صوبہ پنجاب میں سائیوال کے ایک سکول نے طلبا کو ایک ہدایت نامہ جاری کیا ہے جن میں ان سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ سکول اور سکول سے باہر خراب قسم کی زبان استعمال کرنے سے باز رہیں۔"(۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی انہوں نے پنجاب میں پیش آمدہ واقعے کو بیانیہ انداز میں قارئین کے گوش گزار کیا ہے۔ ہمارے ملک کا یہ المیہ ہے کہ ہم آج تک ذہنی غلام ہیں ۔ ہم انگریزی کے حصار میں پھنس چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ عالم فاضل ہونے کا معیار اب انگریزی زبان آتا ہے۔ اس المیے کو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے متذکرہ کالم میں بیان کیا ہے۔ سکول کی طرف سے جاری ہونے والا حکم نامہ ہمارے قومی المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پنجابی جو کہ مادری زبان ہے اس کو گندی زبان کہنا کتنا احمقانہ فعل ہے۔ ایسے ہی پنجاب کے ادب سے اردو ادب بھی ہوتا۔ اسی پنجابی میں اعلی پائے کے شعراء پیدا ہوئے جن کا فکری تقابل یورپ کے بڑے بڑے شعراء سے کیا جا سکتا ہے۔ شاہد صدیقی صاحب اسی طرح روزمرہ واقعات کو اپنے کالموں میں بیانیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کہانی پن پیدا کرنے کا مقصد بھی دراصل دلچسپی کو قائم رکھنا ہے۔

بعض اوقات تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی کہانیاں تلاش کرتے ہیں ۔ اپنے کالموں کے مواد کے حصول کے لیے ڈاکٹر شاہد صدیقی بہت متحرک رہتے ہیں۔ مظفر خان پر کالم لکھنا تھا تو وہ ملتان پہنچ گئے۔ پھر ان کے تخیل نے جو کہانی بیان کی ملاحظہ ہو۔

"چند لمحوں میں مظفر خان کی آنکھوں کے سامنے اس کی زندگی کے واقعات آئے اور گزر گئے ۔ اب فیصلہ کن معرکہ آچکا تھا وہ اپنے پانچ بیٹوں اور بیٹی کے ہمراہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ داد و شجاعت دینے لگا۔"(۳)

مظفر خان جنہوں نے سکھوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جو کہ ملتان کے ہیرو تھے۔ ان پر کالم لکھنا مقصود تھا تو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ملتان کا رخ کیا اور وہاں میدان میں بھی گئے جہاں پر مظفر خان نے داد شجاعت دکھائی تھی۔ وہ جاننے کے بعد ڈاکٹر شاہد صدیقی نے پرواز تخیل سے کالم لیتے ہوئے پیچھے کی طرف تخیلاتی سفر کیا تو میدان کارزار ان کی آنکھوں کے سامنے اسی میدان میں پیش آمدہ واقعات کو شاہد صدیقی صاحب نے بیانیہ انداز میں پیش کیا۔

اس طرح بیانیہ انداز کی تکنیک انہوں نے اپنے کالموں میں بھرپور انداز میں استعمال کی ہے۔ میدان جنگ کے واقعات کا بیان ہو، ہمارے معاشرتی المیے ہوں، روزمرہ زندگی کے واقعات کا بیان ہو تو ہر جگہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کا قلم جواہر بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔

زندگی میں کچھ واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں جو انسان کے عقائد کو متزلزل بنا دیتے ہیں۔ دیوان سنگھ مفتون اردو ادب کے مشہور لکھاری ہیں ان کو بھوتوں پر یقین نہیں تھا لیکن کچھ واقعات ایسے رونما ہوئے کہ ان کو بھوتوں پر یقین ہو گیا۔ اپنی آپ بیتی ناقابل فراموش میں انہوں نے واقعات کو بیان کیا ہے۔ شاہد صدیقی صاحب نے بھی اپنے کالموں میں اس آپ بیتی پر تبصرہ کرتے ہوئے بیانیہ انداز اپنایا ہے: ''یہ دیوان سنگھ مفتون کا آنکھوں دیکھا احوال ہے یاد رہے مفتون کا بھوت پریت پر کبھی یقین نہیں رہا۔''(۴)

اسی طرح مفتون صاحب کے متزلزل ہونے والے عقائد کو بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی نے طشت از بام کرتے ہوئے بیانیہ انداز اپنایا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ ہم اپنے پرکھوں سے ماضی کے واقعات سنتے ہیں۔ ان واقعات سے ہم بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ماضی کے یہ واقعات ہمیں مسحور کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی شاہد صدیقی صاحب اپنے والد سے سنے ہوئے واقعات کو بھی بیانیہ انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں: ''والد صاحب بتاتے کہ انہوں نے وہ تقریر ایک درخت پر چڑھ کر سنی۔ وہ یہ واقعہ اکثر بچوں کو سنایا کرتے تھے۔''(۵)

یہ دراصل ایک تقریر کے متعلق اپنی یاد کو بیان کیا ہے۔شاہد صدیقی صاحب کے والد نے قیام پاکستان کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے یہ واقعہ وہ سب کو سنایا کرتے تھے۔ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے والد کی خوشگوار یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے بھی یہ کالم لکھتے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم برصغیر کے مسلمانوں کے چہیتے لیڈر بن کر ابھرے لوگ ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں بچھاتے تھے۔

ایک جلسے میں قائداعظم نے تقریر کرنی تھی۔اس تقریر کو سننے کے لیے لوگوں کا ایک انبوہ کثیر اُمڈ آیا۔پنڈال میں جگہ نہ تھی۔اطراف وجوانب میں بھی جگہ کم تھی۔ڈاکٹر شاہد صدیقی کے والد صاحب نے بھی قائداعظم کی یہ تقریر ایک درخت پر چڑھ کر سنی اور اپنے محبوب قائد کو ان آنکھوں سے دیکھا۔پھر اس واقعہ کو ان کے والد صاحب بڑے والہانہ انداز میں سنایا کرتے تھے۔یہی بیانیہ طریقہ ہے جس کے تحت ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے کالموں میں برت کر قاری کا دل موہ لیتے ہیں۔

انسان کا اسکول کا دور بھی اس کے لیے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں ہوتا۔اس دور میں انسان دنیا کے وبالوں اور جنجالوں سے بے فکر ہوتا ہے۔شاہد صدیقی صاحب بھی اپنے بچپن کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے بہت لطف محسوس کرتے ہیں۔وہ اپنے بچپن کے اساتذہ اور ہم جماعتوں کے ہمراہ گزرے لمحات اور تجربات کو بیانیہ انداز میں اپنے کالموں میں استعمال کرتے ہیں۔وہ رقم طراز ہیں:

> ”ماسٹر فضل صاحب کا اپنا ایک بیٹا خلیق بھی ہماری کلاس میں پڑھتا تھا۔میں اور خلیق بدقسمتی سے پہلی قطار میں بیٹھے تھے اور یہ حکم ماسٹر فضل صاحب کا تھا۔مجھے یاد ہے کہ ایک بار خلیق نے حساب کے ایک سوال میں غلطی کی تو انہوں نے اسے اٹھا کر دیوار سے دے مارا۔“(۶)

اپنے بچپن کے اساتذہ کے واقعات کو شاہد صدیقی نے متذکرہ بالا کالم میں بیانیہ انداز اپناتے ہوئے سپرد قلم کیا۔اپنے استاد ماسٹر فضل صاحب جو کہ حساب کے استاد تھے۔بہت سخت گیر تھے۔قدیم خیالات اور

وضع کے مالک تھے۔ ان کی خاص بات کہ وہ غلطی پر کبھی بخشتے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم ان سے بہت ڈرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی کلاس میں ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس سے غلطی ہوئی تو اس کو دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اس سے ماسٹر فضل صاحب کے سخت گیر اور اصول پرست ہونے کا انداز لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے تجربات کو بیانیہ تکنیک میں پیش کیا ہے۔

بعض اوقات انسان اپنے بچھڑ جانے والے دوست کو بھی یاد کرتا ہے۔ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور اوقات کو کبھی کبھار یاد کرتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بھی امینہ سید کے متعلق ایسا ہی انداز اپنایا ہے۔ امینہ سید کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے ان کے ساتھ گزری اپنی ملاقات کا تذکرہ بھی اپنے کالم میں کیا ہے: ''چراغوں کو دیکھتے ہوئے کہا میں جس گھر میں پیدا ہوئی وہاں علم و ادب کی فضا تھی۔''(۷)

امینہ سید کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کی تھی۔ اسی تقریب کی یادوں کو سمیٹ کر رکھا اور پھر اس کالم میں انہوں نے بیان کر دیا۔ امینہ سید جنہوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کی اور خوب ترقی کی منازل طے کیں۔ دراصل ان کی پرداخت ہی ادبی فضا میں ہوئی تھی۔ قراۃ العین حیدر ان کی رشتہ داروں میں سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ پڑھے لکھے گھرانے سے ہونے کی وجہ سے امینہ سید بھی ایک روشن خیال اور محنتی خاتون تھیں۔ انہو ں نے اپنے زور بازو سے اپنی کائنات تخلیق کی۔

۲۔ اختصار

کالم ایک ایسی صنف ہے جس میں اختصار بے حد ضروری ہے۔ طوالت اور لمبی چوڑی کہانیوں سے کالم نگار اجتناب کرتا ہے۔ اخبار کے صفحے میں کالم کے لیے ایک جگہ مختص ہوتی ہے کالم نگار کو اپنی بات بہت جچے تلے الفاظ میں جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کرنی پڑتی ہے۔ محمد اسلم ڈوگر نے بھی اس حوالے سے لکھا ہے۔

"کالم نویس کے لیے اختصار بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ کالم نویس کو تقریباً ایک ہزار الفاظ میں بات مکمل کرنا ہوتی ہے۔ اگر کالم طویل ہو تو کالم نہیں رہتا بلکہ مضمون نما چیز بن جاتا ہے۔"(۸)

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کالم نویس کے لیے اختصار لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ کالم نگار مختصر الفاظ میں اپنی بات کو بیان کرتا ہے۔ کالم نویسی چوڑی تقریروں اور کہانیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کالم کا اختصار ہی اس کو کالم بنا کر دوسری چیزوں سے جدا کرتا ہے۔ شاہد صدیقی صاحب کے کالموں میں ہمیں ایسا اختصار ملتا ہے جو کہ اپنی بات کو بھی پوری طرح بیان کر دیتا ہے اور یہ اختصار گراں بھی نہیں گزرتا۔ کہیں بھی انسان تشنہ نہیں رہتا بلکہ وہ جو جاننا چاہتا ہے وہ اسے مختصر الفاظ میں بھی مل جاتا ہے۔

کالم چونکہ داستان، ناول اور افسانے سے جدا صنف ہے۔ اس لیے اس میں اختصار کو خاص طور پر مد نظر رکھنا نہ ہی مقالے کی طرح بات کو پھیلا کر بیان کرنا مقصد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں اختصار کو کمال فن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ان کے اس انداز کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا: "ٹیرس میں دو سفید کرسیاں، جن کے درمیان سفید گول میز کرسیوں پر بھی آمنے سامنے میں اور میرا بیٹا۔"(۹)

شاہد صدیقی صاحب نے کالم کے فنی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اطراف و جوانب پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ منظر کو مختصر اور جامع الفاظ میں قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ متذکرہ بالا اقتباس میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر جامع، مختصر اور مکمل منظر ان کے ہاں ملتا ہے۔ اس طرح کا اختصار کمال فنی چابکدستی کی علامت ہے۔ شاہد صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ لمبی چوڑی بات نہیں کرتے بلکہ بہت جچے تلے الفاظ میں اپنا مکمل مدعا بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے کالموں کا اختصار کس انداز میں قاری کو متاثر کرتا ہے ذرا ملاحظہ ہو:

"اس روز دور دور تک اجلی دھوپ کا بسیرا تھا اور ہوا میں ہلکی خنکی کی آمیزش۔ میری منزل سائیوال سے ۲۷ کلو میٹر دور ہڑپہ تھی۔"(۱۰)

یہ خوبصورت اختصار بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے ہڑپہ کے سفر پر جانا تھا۔ لمبی چوڑی بحث کرنے، طویل منظر کھینچنے اور جزئیات کو اکٹھا کر کے صفحات سیاہ کرنے کے بجائے موصوف نے تقریباً تیس الفاظ میں اپنا پورا سفر بیان کر دیا۔ اسی طرح جب کسی شخصیت کے تعارف اور تعریف کی بات ہو تو شاہد صدیقی صاحب کا انداز اختصار دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ یہاں بھی کالم نگار کسی شخصیت کے تعارف میں اپنے الفاظ کا چناؤ کرتا ہے جو کہ مذکورہ شخصیت کا مکمل اور مختصر تعارف پیش کر دیں۔ اسی طرح ایک کالم میں منو بھائی کی شخصیت کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''مختصر الفاظ میں منو بھائی کی شخصیت پر بات کرتا ہوں۔ وہ ایک ترجمہ نگار، صحافی، کالم نگار، ڈرامہ نگار، شاعر، مصور اور دل درد مند رکھنے والے انسان تھے۔''(۱۱)

منو بھائی جو کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ اچھے فن کار اور ادیب تھے۔ وہ صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ ایک خوبصورت دل بھی رکھتے تھے۔ ان کے تعارف کے لیے تو لمبی چوڑی تقریریں ہو سکتی ہیں لیکن ڈاکٹر شاہد صدیقی نے کمال اختصار کے ساتھ ان کا پورا تعارف اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

شاہد صدیقی نے کئی کالم شخصیات کے متعلق بھی لکھے ہیں۔ وہ ہر طرح کے کرداروں کو اپنے کالموں میں موضوع بناتے ہیں۔ انہوں نے چھوٹے کرداروں سے لے کر بڑے بڑے کرداروں پر کالم لکھے ہیں۔ ہر جگہ ان کا قلم جوہر بکھیرتا ہے۔ قومی ہیروز ہوں سیاست دان ہوں یا ادیب ہوں ہر جگہ انہوں نے کردار کا تقاضا پورا کیا ہے۔ بھٹو پر وہ کالم لکھتے ہوئے کس اختصار کے ساتھ مکمل بات کر جاتے ہیں:

> '' ہندوستان کے ۹۰ ہزار قیدیوں کی پاکستان واپسی اور ۱۹۷۳ء کا متفقہ آئین۔ ایٹمی پروگرام کا آغاز، اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد۔'' (۱۲)

بھٹو صاحب کے کارناموں کو صرف چند جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ کالم نگاری ایسے ہی اختصار کا تقاضا کرتی ہے کہ طویل ادوار، کہانیوں اور باتوں کو مختصر طور پر بیان کیا جائے کسی بات میں طوالت بھی پیدا نہ ہو اور جھول بھی نہ رہے۔ یہی وہ اختصار ہے جو ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کو ادب کی دنیا میں لے آتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں اختصار صرف واقعات کے بیان، شخصیات کے تعارف اور تاریخی شواہد کے طشت از بام کرنے ہی میں نہیں ملتا بلکہ ان کا یہ اختصار ہمیں منظر نگاری میں بھی بھرپور طریقے سے ملتا ہے انہوں نے سرسید کالج میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس دور کو یاد کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہد صدیقی بیان کرتے ہیں کہ:

> ''کالج کا مین گیٹ مال روڈ کی طرف تھا۔ گیٹ کے سامنے کچھ خالی جگہ اور پھر ریلنگ ۔۔۔ سرسید کالج کے طلبہ کا اس زمانے میں خاص ٹھکانہ یہی ریلنگ تھا۔''(۱۳)

شاہد صدیقی نے منظر کو بڑے اختصار کے ساتھ پیش کیا۔ سرسید کالج راولپنڈی کا مشہور کالج ہے۔ اس میں شاہد صدیقی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔ اپنے اس کالم میں وہ انہی یادوں کو سمیٹتے ہوئے سرسید کالج کے اطراف کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

اس میں انہوں نے مال روڈ کی طرف کھلنے والے گیٹ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ گیٹ تھا جو کہ طلبہ کی آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ گیٹ کے سامنے ایک قطع عرضی بلکل خالی پڑا ہوا تھا اسی کے ساتھ ایک ریلنگ تھی جو کالج اور مال روڈ کو جدا کرتی تھی۔ اس زمانے میں طلبہ کا ٹھکانہ یہی ریلنگ ہوتی تھی جہاں وہ فارغ اوقات میں اکٹھے ہوتے تھے۔ تمام دوستوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ شاہد صدیقی نے اس تمام بحث کو تین جملوں میں سمیٹ کر اختصار کا خاص خیال رکھا ہے۔

شاہد صدیقی نے اختصار کو صرف منظر نگاری ہی میں استعمال نہیں کیا بلکہ انہوں نے ملتان کا سفر کیا۔ دراصل سلطان مظفر خان پر کالم لکھنا مقصود تھا۔ وہ اسی میدان میں گئے جہاں پر سلطان مظفر خان شہید ہوا تھا۔ میدان جنگ کی تخیلاتی تصویر کو انہوں نے طول دینے کے بجائے اختصار کے ساتھ صرف تین جملوں میں بیان کر دیا۔ ''رنجیت سنگھ کا لشکر کھڑک سنگھ اور مصر دیوان چند کی زیر قیادت قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے۔''(۱۴)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے میدان کارزار کا نقشہ صرف چند جملوں میں پیش کیا۔ یہی اختصار ان کے کالموں کا خاصا ہے۔ اس اختصار نے ان کے کالموں کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ کالم نگاری کا تقاضا بھی ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختصار شاہد صدیقی صاحب کے کالموں کی اہم فنی خوبی ہے جو ان کو معاصر کالم نگاروں میں ممتاز بناتی ہے۔

۳۔ فصاحت وبلاغت

جہاں تک فصاحت اور بلاغت کا تعلق ہے۔ فصاحت دو طرح کی ہوتی ہے ایک کا تعلق مفرد لفظ سے ہے جب کہ دوسری قسم کی فصاحت کا تعلق جملے سے ہے اس طرح اردو دان طبقے نے مختلف انداز میں فصاحت کی تعریف کرنے کی سعی کی لیکن کوئی بھی جامع اور مانع تعریف نہیں پیش کر سکا ہاں کچھ تعریفیں فصاحت کے زیادہ طرح خصائص لیے ہیں۔ نقادوں نے کہا کہ کلام میں تنافر نہ ہو، غرابت نہ ہو اور نامانوس لفظ نہ آئیں تو کلمہ فصیح ہو گا جبکہ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی نے فصاحت کے بارے میں کہا:

> ''اگر یوں کہہ دیا جائے کہ فصاحت موزوں الفاظ کے انتخاب کا نام ہے تو بھی درست نہ ہو گا۔ بہر حال فصاحت کے لیے لازم ہے کہ انشا پرداز الفاظ کے انتخاب اور ان کے استعمال میں پہلے تو احتیاط برتے اور پھر اس بات کو ملحوظ رکھے کہ الفاظ و کلمات کی ترتیب وہ جمالی عنصر رکھتی ہو جو ادبی تخلیقات کو دوسری تحریروں سے ممیز کرتا ہے۔''(۱۵)

فصاحت کے ساتھ بلاغت کو ملا کر ایک ادبی اصطلاح تراشی جاتی ہے۔ بلاغت دراصل پوری طرح فصاحت پر منحصر ہے۔ کلام کا فصیح ہونے کے ساتھ ساتھ اقتضائے حال کے مطابق ہونا بلاغت کہلاتا ہے۔ جیسا منظر تخلیق کار نے پیش کرنا ہو ایسے ہی الفاظ وہ لاتا ہے کہ تصویر پوری طرح آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ کسی کردار کو ہی لے لیجیے جب فن کار اس سے گفتگو کرواتا ہے وہ بھی اس کے شایان شان ہوتی ہے۔ اگر کوئی عالم اور پڑھا لکھا ہے تو اس سے عالموں والی ہی گفتگو کروائے گا۔ جو جذبہ پیش کرنا ہو ایسے ہی جاندار الفاظ لاتا ہے کہ جذبہ پوری طرح واضح اور عیاں ہو جاتا ہے۔ اس طرح فصاحت اور بلاغت باہم پیوست ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے فنی مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے ہاں متذکرہ بالا ادبی اصطلاحات کا استعمال کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔ جب شاہد صدیقی صاحب مولانا رومی کے مزار پر جاتے ہیں تو کیسی پر کیف تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں:

> ''مزار کے اندر روحانیت کی خوشبو مہک رہی تھی۔ عقیدت کے پھول کھل رہے تھے۔ ایک عالم استغراق ہے۔ کچھ لوگ نوافل ادا کر رہے ہیں اور کچھ دعاؤں میں مصروف ہیں۔''(۱۶)

متذکرہ بالا اقتباس سے کیسی خوبصورت اور پر کیف تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ انسان عالم وجود میں آ جاتا ہے۔ اتنی بڑی روحانی شخصیت کے مزار پر روحانی نور پوری طرح برس رہا ہے۔ اس تصویر کو ڈاکٹر شاہد صدیقی کے قلم نے اور چار چاند لگا دیے ہیں۔ الفاظ کا چناؤ، ان کی نشست اور پھر بر محل استعمال نے ایسی منظر نگاری کی ہے کہ دل چاہتا ہے ہم بھی ایسی روحانی کیفیت میں مبتلا ہو جائیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی روز مرہ کے تجربات کو بھی بڑے فصیح اور بلیغ انداز میں قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں: ''سکول میں جسمانی سزائیں عام طور پر اور ذہنی ایذائیں خاص طور پر طلبا کو ڈرپوک، خوفزدہ اور کولہو کا بیل بنا دیتی ہیں۔''(۱۷)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ہمارے ہاں پائی جانے والی اہم اور نہایت ہی بری قباحت کو بڑے جاندار الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس تصویر کاری کے بعد ہمیں سکول میں دی جانے والی تمام قسم کی سزاؤں اور ایذاؤں کے نقصانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جسمانی ایذائیں اتنی خطرناک نہیں جتنی کہ ذہنی ایذائیں لہذا اساتذہ کو ایسی کسی بھی قسم کی ایذا دینے سے پرہیز کرنی چاہیے جو طلبہ کی شخصیت پر منفی اثرات مرتب کریں۔

موسموں کی رنگینی کی تصویر کو بھی فن کار اپنے انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسی تصویریں ہمیں موسموں کی کیفیت کے بارے میں پوری طرح آگاہی فراہم کرتی ہیں۔ فن کار کہیں برف باری کی تصویر کو پیش کرتا ہے اور کسی جگہ موسم بہار کے رنگوں کو کاغذ پر بکھیرتا ہے۔ شاہد صدیقی صاحب کی تصویر ملاحظہ ہو:

> ''مارچ کی بہتی لہروں کی اپنی مہک ہوتی ہے۔ اوائل بہار کی مہک جو کبھی کبھی انگلی تھام کر ان جانے کوچوں میں لے جاتی ہے۔ یہ بھی مارچ کا مہینہ ہے اور اوئل بہار کی مہک میری انگلی تھام کر مجھے ملتان کے قلعہ قاسم باغ لے آئی۔''(۱۸)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اوائل بہار کی کیفیت کو پیش کرنے کے لیے جیسے الفاظ کا چناؤ کیا پھر ان کو بر محل استعمال کیا۔ یہ فصاحت و بلاغت کی بڑی عمدہ مثال کہی جا سکتی ہے۔ مارچ کے مہینے رنگینیاں اور رعنائیاں انسان کے اندر جینے کی مزید امنگ پیدا کر دیتی ہیں۔ انسان آگے کی طرف جانا چاہتا ہے اور زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اوائل مارچ میں ہر طرف پھول کھلتے ہیں۔

درخت سبز پتوں کی چادر اوڑھ لیتے ہیں اور زمین پر سبز بچھونا بچھ جاتا ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو جب بادِ نسیم کے ساتھ آبادیوں کا رخ کرتی ہے۔ تو ہر چیز پُر کیف حالت طاری ہو جاتی ہے۔ انسان اس کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے قلم سے اس تصویر کو مزید واضح کر دیا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ ہم روز مرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ٹرین ہمارے گھر کے قریب سے گزرتی ہے تو جو حالت اس وقت بنتی ہے اس کا بیان اور انداز بھی قابل تعریف ہے: ''مجھے اب تک یاد ہے جب ٹرین ہمارے گھر کے پاس سے گزرتی تو ہمارے گھر کی کھڑکیاں بجنے لگتیں اور گھر بھر میں ارتعاش آجاتا۔''(۱۹)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے بچپن کے تجربات کو بعینہ بیان کیا۔ اس منظر کو ہمارے سامنے پیش کیا جب ٹرین ان کے گھر کے پاس سے گزرتی تھی۔ اس کے لیے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا جو اس کیفیت کو پوری طرح ہمارے سامنے پیش کر دے۔ یہی فصاحت و بلاغت کا انداز ہمیں ان کے کالموں میں نمایاں انداز میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے خاص طور پر موسموں کے بیان میں خوب جادو گری دکھائی ہے۔ اس بیان نے ان کے بڑا فن کار ہونے کا ثبوت جو دیا ہے۔ پہلے بھی ایک جگہ اوائل مارچ کی عکاسی کا تذکرہ ہوا۔ اب ذرا بارش کے موسم اور تصویر اس کے لیے شاندار الفاظ کے چناؤ نے اس تصویر کو کتنا کامل اور اکمل بنا دیا ہے:

> ''درختوں سے سرخ پھول ٹوٹ ٹوٹ کر اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں لال کُرتی کے باسیوں کی طرح جو کل تک ادھر ہی تھے لیکن اب ان منظروں کا حصہ نہیں ہیں۔''(۲۰)

اب شاہد صدیقی صاحب نے بڑی عمدہ تشبیہ بھی تراشی ہے۔ یہ انوکھی، نرالی اور نادر تشبیہ ہے کہ درختوں کے پتوں کی طرح لال کُرتی کے باسی بھی بکھر گئے ہیں۔ خزاں کے موسم کو ہمیشہ بچھڑنے، دور ہونے اور غمزدہ ہونے کی علامت بھی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کالم نگار نے بھی متذکرہ اقتباس میں بچھڑے ہوئے دوستوں اور گزرے ہوئے وقتوں کو یاد کیا ہے۔ یہ جذبہ ہر دل کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح فصاحت اور بلاغت ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں پائی جانے والی اہم، فنی صفت اور خوبی ہے جو ان کے پیش کردہ مناظر، جذبات اور تصویروں کو اور بھی جاندار اور پُر اثر بنا دیتی ہے۔

۴۔ منظر نگاری

منظر نگاری کسی بھی فن پارے کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ منظر نگاری دراصل ایک فن کار اپنے فن پارے کو زیادہ جاندار بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ منظر کئی طرح کے ہوسکتے ہیں جو تصویر کے اندر مزید جاذبیت پیدا کر دیتے ہیں۔ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم ادب سے جدا نہیں بلکہ عین ادبی فن پارے ہوتے ہیں انہوں نے اپنے کالموں میں خوبصورت مناظر کو پیش کیا ہے۔ جو ان کے فن کار ہونے کی ایک علامت ہے۔ انہوں نے اطراف کے مناظر کو اور بھی جاندار بنادیا ہے۔

شہر کی منظر نگاری کے لیے انہوں نے جامع الفاظ کا چناؤ کیا اور تصویر کو پوری طرح ہمارے سامنے پیش کر دیا: ''تیرھویں صدی کا قونیہ۔۔ باہر تاریکی کا سمندر جس میں برف سے اٹے ہوئے راستے اور درخت چھپ گئے تھے۔ کمرے کا ماحول گداز تھا۔''(۲۱)

شاہد صدیقی صاحب نے استنبول کا سفر اختیار کیا۔ وہاں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے انہوں نے '' دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' کے مصداق تیرھویں صدی کے قونیہ (شہر) کی تصویر پیش کی جب طویل سرد راتیں ہوتی ہیں۔ ہر طرف تاریکی کا سمندر ہے۔ اس دور کی عمدہ منظر نگاری نظر آتی ہے۔

استنبول کی طرف ڈاکٹر شاہد صدیقی کا سفر بہت عمدہ رہا وہاں پر انہوں نے بڑے خوبصورت مناظر دیکھے۔ چیزوں کا بھرپور مشاہدہ کیا۔ گہری بصیرت اور بصارت کے طفیل انہوں نے جاذب نظر تصاویر پیش کیں:

> ''ٹیرس سے اس طرف خوش نما منظروں کا ایک جمگھٹا، دائیں بائیں اور سامنے حد نظر تک پانی کا پھیلاؤ اور سطح آب پر تیرتے ہوئے رنگ برنگ بحر اور کشتیاں، ٹیرس سے بائیں طرف نگاہ کریں تو طویل پل دکھائی دیتا ہے۔''(۲۲)

ڈاکٹر شاہد صدیقی کی بھرپور منظر نگاری متذکرہ بالا اقتباس میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ استنبول کے سفر میں انہوں نے جو منظر دیکھا پھر اس کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیا۔ جس طرف انہوں نے نگاہ ڈالی ان کی چشم حسن شناس نے ہر طرف حسین منظر ہی دیکھا۔ سمندر کا پانی حدِ نظر تک پھیلا ہوا، وہاں پر لوگوں کی اپنی مصروفیات، سطح آب پر تیرتے ہوئے بحر اور کشتیاں اور ساتھ ہی ایک طویل پل کا بھی منظر پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بعض کالموں میں منظر نگاری کا بھرپور تقاضا پورا کیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اشیاء مل کر جو حسین منظر بناتی ہیں ان کو صفحے پر بکھیر کر ایک کامل تصویر پیش کی ہے: ''سفید دودھیا ٹائلوں سے بارہ دری کی طرز پر بنا ایک چبوترہ۔ اس کے اطراف میں اونچے لمبے درختوں کا ہجوم۔''(۲۳)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ایک خوشنما منظر کو پیش کیا ہے۔ دیہات کی بھرپور منظر نگاری متذکرہ بالا اقتباس میں دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہ بھی انہوں نے ایک گاؤں جھاعرہ کا سفر کیا تھا، اس کے قریب یہ منظر انہوں نے دیکھا اور ان کے تخلیق کار قلم نے اس تصویر کو ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت چبوترہ بنا ہوا تھا اس کے اطراف اونچے اونچے درختوں نے اس منظر کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا تھا۔

دیہاتوں ہی کی نہیں بلکہ شہروں کے موسموں کی منظر نگاری بھی ان کے کالموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسلام آباد شہر کے موسم کا منظر کچھ یوں بیاں ہوا ہے: ''اس دن اسلام آباد کا آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ شام ڈھلتے ہی ہلکی پھوار کا آغاز ہو گیا جو جلد ہی موسلا دھار بارش میں بدل گئی۔''(۲۴)

اسلام آباد میں ایک دن شاہد صدیقی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کافی بھی بنائی ہوئی تھی اور ساتھ مطالعے کے لیے ایک ناول بھی رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی کھولی تو باہر دیکھا کہ بادلوں سے آسمان پوری طرح چُھپ چکا ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ پہلے ہلکی بارش اور بعد میں تیز بارش شروع ہو گئی۔ درختوں کے پتے بھی گرے جا رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے تخیل کا کمال یہ ہے کہ جن اداروں میں انہوں نے ماضی میں پڑھایا پڑھا یا ان کی منظر نگاری بھی ان کے کالموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سر سید کالج راولپنڈی میں بھی وہ زیر مطالعہ رہے، اسکی تصویر ان کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"میں بنچ سے اٹھ کر شیشے کی بڑی کھڑکی سے نیچے جھانکتا ہوں۔ جہاں سے کالج کا مختصر سا لان نظر آتا ہے۔ جن میں سرسبز گھاس اور کیاریوں میں پھول کھلے ہیں۔"(۲۵)

انٹر کے دوران ڈاکٹر شاہد صدیقی سر سید کالج میں زیر تعلیم رہے، وہاں پر وہ بعد میں گئے تو انہوں نے گزرے لمحات کو تازہ کرنے کے لیے کالم لکھا تھا۔ وہاں پر ہی انہوں نے اپنے کالج کا ایک خوشنما منظر قارئین کے سامنے بھی پیش کیا۔

شہروں، دیہاتوں اور موسموں کی منظر نگاری کے علاوہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں میدان جنگ کی منظر نگاری بھی دکھائی دیتی ہے۔ ماضی کے اہم معرکوں کو وہ چشم تصور کے ذریعے سے زندہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جلیانوالہ جو کہ بھرپور معرکہ ہوا تھا۔ اس کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے:

"توپ کے گولوں کی مہیب گھن گرج، بے قرار گھوڑوں کی ہنہناٹیں، زخمیوں کی کراہیں دن کے اختتام تک میدان جنگ لاشوں سے اٹ گیا تھا۔"(۲۶)

میدان جنگ میں پیش آمدہ واقعات کی جاندار تصویریں ہمیں ان کالموں میں نظر آتی ہیں۔ میدان حرب کے تمام مناظر اس چھوٹے سے اقتباس ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ متذکرہ بالا علاقے میں پایا جانے والا خوف وہراس بھی انہوں نے عیاں کیا ہے۔ بعض اہم شخصیات پر بھی انہوں نے کالم لکھے۔ ان کالموں میں موضوع بحث شخصیت کے رہن سہن، نشست و برخاست اور طعام و آرام کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ قاری ان کی منظر نگاری اور فن کاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبال کی زندگی کی منظر نگاری بھی بھرپور انداز سے ہمارے سامنے یوں پیش کرتے ہیں:

"علامہ اقبال ایک دھوتی اور بنیان میں ملبوس ایک تکیے کے سہارے نیم دراز تھے اور ان کے سامنے حقہ رکھا ہوا تھا۔"(۲۷)

دراصل یہ واقعہ انہوں نے اپنے والد صاحب کی زبانی سنا تھا۔ والد صاحب نے علامہ اقبال کی زندگی اور آنکھوں دیکھا حال کسی وقت گھر میں بیان کیا تو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے کمال ہنر مندی سے اس کی ایسی منظر نگاری پیش کی کہ علامہ اقبال کی تصویر ہمیں اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔ کہ علامہ اقبال گھر میں کس بے تکلفی سے رہتے تھے۔ عشق، خرد اور خود کی گھتیاں سلجھانے والا شاعر کس طرح سادہ زندگی بسر کرتا تھا اس اقتباس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

راجہ پورس اور سکندر اعظم کے مابین پیش آنے والے معرکے کی منظر نگاری بھی انہوں نے اپنے بھرپور تخیل کے ذریعے سے پیش کی ہے۔ اس میں ہم ان کی ہنر مندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ٹیلے پر ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے ہیں۔ میں ٹانگیں پسیار کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں سوچتا ہوں یہی جگہ تھی۔ مئی کا گرم خوں مہینہ تھا۔ دریائے جہلم کی بپھری ہوئی لہروں کا شور تھا۔ سیاہ رازوں بھری رات تھی اور ۳۲۶ قبل مسیح کا سال تھا۔''(۲۸)

متذکرہ بالا اقتباس میں ہم نے ڈاکٹر شاہد صدیقی کی منظر نگاری ملاحظہ کی۔ اس اقتباس میں بیک وقت موسم کی منظر نگاری اور میدان جنگ کی منظر نگاری پیش کی ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے تخیل کی قوت سے اس منظر کو آج دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قارئین کو بھی دکھایا۔ دراصل راجہ پورس اور سکندر اعظم کے مابین قبل مسیح میں جو معرکہ ہوا اس کی منظر نگاری متذکرہ بالا اقتباس میں کی گئی ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے یہ معرکہ پیش آیا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی اس موضوع پر کالم لکھنے کے خواہش مند تھے یہی وجہ سے انہوں نے اس جگہ کا سفر اختیار کیا۔ وہاں پر تاریخ سے آگاہی حاصل کی اور چشمِ تخیل سے ان تصاویر اور میدان جنگ کے مناظر کو اپنے کالم میں پیش کر دیا۔ اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں منظر نگاری میں بڑا تنوع اور رنگارنگی ہے ان کے ہاں کئی چیزوں کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مناظر میں زیادہ تر مناظر تخیلاتی ہیں۔ یہ بڑے فنکار کی علامت ہے۔

۵۔ تجسس

تجسس ایک اہم ادبی اصطلاح ہے۔ دراصل ادبی فن پارے میں قاری کی دلچسپی بر قرار رکھنے کے لیے تجسس کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں بھی ہمیں تجسس کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کے تجسس کا انداز یہ ہے کہ قاری خود ان کے کالم پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور قاری کے اندر بھی کس انداز سے تجسس بیدار ہو جاتا ہے۔

> ''اچانک دروازے پر دستک ہوئی تھی کسی نے شمس کا نام پکارا تھا۔ رومی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھا لیکن شمس نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔''(۲۹)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے قونیہ شہر کا سفر اختیار کیا۔ وہاں پر مدفون دو عظیم روحانی شخصیات سے شاہد صدیقی گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان محبوب شخصیات کا تذکرہ بڑے پُر اسرار انداز میں کیا ہے۔ شمس کی موت سے قبل ایک پُر اسرار دستک ہوئی۔ شمس اس کو سمجھ گئے لیکن رومی کے لیے یہ بات خالی از دلچسپی نہ تھی۔ لیکن شمس نے اسے منع کر دیا۔ اب انہوں نے منع کیوں کیا یہاں تجسس کا انداز ہے جس کا جواب آخر میں جا کر ملتا ہے کہ دراصل شمس کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مژدہ اجل ہے۔ بعض جگہوں کے بارے میں بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ بریڈ لال ہال، جو کہ راولپنڈی میں ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس عمارت کو کبھی اندر سے نہیں دیکھا کیونکہ یہ کئی برسوں سے بند پڑی ہے۔ اس کے دروازوں پر قفل پڑے ہیں۔ اس عمارت میں کیا خاص بات ہے جو ہمیں اپنی طرف بلاتی ہے۔''(۳۰)

ڈاکٹر شاہد صدیقی کا استفہامیہ انداز قاری کے اندر تجسس بیدار کر دیتا ہے کہ اس عمارت میں کیا خاص بات ہے اس کا قفل آج تک بند پڑا ہوا ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی بھی پنڈی کے قدیم باسی ہونے کے باوجود اس کو نہیں دیکھ سکے۔ دراصل ڈاکٹر شاہد صدیقی تین بار یہاں گئے لیکن عمارت کو اندر سے دیکھنے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ اس طرح یہ ایک پر اسراریت بن جاتی ہے جو قاری کے اندر تجسس بیدار کر دیتی ہے۔

بعض شخصیات کے متعلق بھی لکھتے ہوئے ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں تجسس کا عنصر پیدا کیا ہے وہ لکھتے ہیں: ''مفتون سنگھ کبھی بھوتوں جنوں کا قائل نہیں رہا۔ اس شخص کے بارے میں سن کر ان کے اندر کا صحافی جاگ اٹھا۔''(۳۱)

دیوان سنگھ مفتون کو بھوت، جنوں اور پریوں کے بارے میں یقین نہ تھا۔ وہ ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص کے ساتھ جنوں اور پریوں کا کوئی سانحہ پیش آیا تو دیون سنگھ مفتون بحیثیت صحافی اس قصے کی کھوج میں لگ گئے۔ اب یہاں پہ دلچسپی کے عناصر ہیں کہ آخر وہ کیوں ایسے شخص میں دلچسپی لینے لگے جبکہ ان کو مافوق الفطرت اشیاء پر اعتقاد ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں ایک اور انداز نمایاں ہے کہ وہ کالم کے شروع میں کچھ ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جو کہ بہت دلچسپ ہوتے ہیں تو قاری کو پورا کالم پڑھنے پر اُکساتے ہیں۔ اسی طرح کا استفہامیہ انداز:

> ''ان خاک زادوں کی یادگاریں کہاں ہیں جو اس سرزمین سے اٹھے اور جنہوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر اپنی مٹی کی حفاظت کی تھی۔۔''(۳۲)

شاہد صدیقی صاحب شروع میں ایسے سوالات اٹھاتے ہیں کہ قاری ان جوابات کو تلاش کرنے کے لیے پورا کالم پڑھنا چاہتا ہے۔ کالم کے مطالعے کے دوران ہی قاری پر ان سوالات کے جوابات بھی آشکار ہو جاتے ہیں۔ یہ انداز انوکھا، نرالا اور نادر ہے جو ان کے کالموں کی ایک اہم فنی خوبی ہے۔ یہی انداز امینہ سید پر لکھے ہوئے کالم میں بھی نمایاں ہے:

> '' یہ پاکستان میں ایک عورت کی عزم و ہمت کی انوکھی داستان تھی۔ جس نے راستے کی تمام مشکلات کے باوجود ایک ادارے کو بام عروج تک پہنچا دیا۔''(۳۳)

موصوف نے کالم کے شروع میں بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ پاکستان میں ایک عورت ایسی بھی ہے کہ جس کے طفیل ایک ادارہ بام عروج پر پہنچا۔ قاری یہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور وہ اس عورت کے بارے میں مزید جاننا چاہتا ہے جب کالم کا مطالعہ کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ عورت امینہ سید اور وہ ادارہ آکسفورڈ پریس کا ہے۔ اس طرح دلچسپی اور تجسس کے عناصر پیدا کرتے ہوئے اپنے کالموں کو قاری کے لیے مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

۶۔ فطرت نگاری

فطرت نگاری ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کی ایک اور اہم فنی صفت ہے۔ ان کے ہاں ہمیں گل ولالہ سے کلام پیدا کرنے والی خوبی نظر آتی ہے۔ موسموں کے رنگوں کا بیان ہو یا کسی بہتی ندی کا تذکرہ ہر جگہ یہ صفت نمایاں ہے۔ ان کو مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے ان کے ہر کالم میں کہیں نا کہیں مناظر فطرت کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ قوس قزح کے رنگوں سے بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی صاحب کو بڑا شغف ہے:

"بارشوں کے بعد کھلے آسمان پر سات رنگوں کی قوس قزح پھیل جاتی ہے۔ گاؤں میں ہم قوس و قزح کو بڑھیا کی پینگ کہتے تھے۔"(۳۴)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے یہ خوش نما منظر کہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ اب وہ اس منظر کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ ایک دن موسلا دھار بارش ہوئی۔ اس کے بعد جب بارش تھمی تو وہ باہر گئے تو دیکھا کہ قوس قزح سات رنگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بچپن کے اس واقعہ کو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے کمال فطری انداز میں پیش کیا۔ جب قوس قزح پھیل چکا شاہد صدیقی صاحب اور ان کے دوست اس کو پکڑنے کے لیے دوڑے تو وہ اور اوپر اٹھتا اور ان سے دور ہو تا گیا۔ اس واقعہ سے بچپن کی معصومیت کی جھلک کتنی جاذب نظر ہے۔ بہتے ہوئے دریاؤں کی روانی اور چلتے ہوئے پانی کی آوازیں، دریا کی لہریں اور اس کی موجوں کی عکاسی بھی فنکار اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں:

" میرے چاروں طرف دریائے سندھ کا ہلکورے لیتا پانی۔ ان پانیوں کے بیچوں بیچ ایک جزیرہ جس میں سنگ مرمر بنا ہوا دو سال پرانا مندر۔"(۳۵)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے دریائے سندھ کی خوبصورت منظر کشی مندرجہ بالا اقتباس میں کی ہے۔ یہ دراصل عناصر فطرت سے گہرا لگاؤ اور شغف ہی ہے جو تخلیق کار کو فطرت نگاری پر اکساتا ہے۔ دریا کے درمیان ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس چبوترے کو دریا کے درمیان میں دیکھ کر انسان فرحت سے جھوم اٹھتا ہے۔ یہ دراصل پرانا مندر ہے جو کہ دریا کے درمیان جزیرے پر واقع ہے۔ اس طرح فطری حسن کا ایک

حسین شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں کی منظر نگاری میں ان کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ گاؤں چونکہ فطرت کے مناظر سے لیس ہوتے ہیں۔ سر سبز و شادب کھیت، ہری بھری فصلیں، سبز پتوں کی بہار، پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیاں، پھلوں سے بھرے ہوئے درخت، ابلتے چشموں کا ٹھنڈا پانی، سایہ دار شجر اور اور اوپر نیلا آسمان یہ تمام مناظر گاؤں میں ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں:

"حد نظر تک پھیلے سرسوں کے سنہری کھیت، کامنی رنگوں والی دھریکیں، زرد بورے والے کیکر، ٹھنڈی چھاؤں والی ٹاہلیاں، میٹھے پانی والا کنواں، اونچے مینار والی مسجد۔۔"(۳۶)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے گاؤں میں پائے جانے والے مناظر فطرت کو کمال فنکاری کے ساتھ بیان کرتے ہوئے قاری کی آنکھوں کے لیے فرحت بخش منظر پیش کیا ہے۔ کالموں میں فطرت نگاری کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود جگہ نکال لینا یقیناً ایک بڑے فنکار کی علامت ہے۔

بارش کی عکاسی بھی ان کے ہاں کئی کالموں میں ہمیں نظر آتی ہے۔ بارش کی جزئیات کو انہوں نے پوری طرح سمیٹ لیا ہے۔ بارش سے ڈاکٹر موصوف کو گہرا لگاؤ ہے ان کے کئی کالموں میں بارش کی عکاسی کی گئی ہے فطرت کا یہ عنصر ان کو کتنا مرعوب ہے اُن کے ایک اور کالم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

"اس روز سارے راستے جل تھل تھے۔ آسمان پر سیاہ گھٹاؤں نے گرد و پیش کے منظر کو تاریک کر دیا تھا۔ دن میں بھی رات کا گمان ہوتا تھا۔"(۳۷)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بیان کیا ہے کہ موسلا دھار بارش کے بعد ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ آسمان پر اتنی گہری گھٹائیں چھا گئیں کہ دن میں بھی رات کا سماں بن جاتا ہے۔ موسم کی شدت کی عمدہ عکاسی اس اقتباس میں موجود ہے۔ فطرت نگاری دراصل کسی بھی فن پارے کا ایک اہم خاصا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بھی فطرت سے لگاؤ کا گہرا ثبوت دیتے ہوئے اپنے کالموں کو مزید رنگین، دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔

۷۔ جزئیات نگاری

جزئیات نگاری دراصل کسی بھی منظر کا لازم ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی اکائیاں اکٹھی کر کے فن کار منظر کی پوری تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بھی اپنے کالموں میں بعض جگہوں پر جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے تقریباً منظر کی ہر اکائی کو پیش کیا ہے۔ سکول میں سزا کے حوالے سے ہی ان کی معلومات دیکھیں: ''ڈنڈے کی عدم موجودگی میں استاد جوتوں ،مکوں اور تھپڑوں کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔''(۳۸)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے سکول میں سزا کے تمام انداز اپنے کالم میں پیش کر دیے کہ اساتذہ کون کون سے انداز اپنا کر بچوں کو سزا دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ذوالفقار علی بھٹو کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں انہوں نے چشم بینا سے چھوٹی چھوٹی جزئیات کو کس انداز سے اکٹھا کیا:

> ''اس مزار کے قریب ایک سکول ہے یہ چھٹی کا دن ہے۔ سکول کے لان میں دو چارپائیاں اور کچھ کرسیاں رکھی ہوئی ہیں میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔''(۳۹)

ڈاکٹر شاہد صدیقی کسی چھوٹے سے ڈھابے پر گئے وہاں پر انہوں نے جو منظر دیکھا اس کی جزئیات کو فنکارانہ انداز میں پیش کر دیا۔ وہاں موجود کرسیوں اور چارپائیوں تک کو منظر میں جگہ دی۔ یہی عمدہ جزئیات نگاری کہی جاسکتی ہے۔ بارش کے موسم میں گاؤں میں بارش سے قبل جس طرح کی افراتفری پیدا ہوئی۔ اس کو بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔ ان کا گاؤں سے بھی تعلق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیشتر کالموں میں گاؤں سے متعلقہ امور کی نشاندہی کی ہے:

> '' ایسے میں صحن میں بنے ہوئے لکڑیوں کے چولہے کو ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس طرح صحن میں بنی ہوئی تندوری کو بھی کسی چیز سے ڈھک دیتے ہیں۔''(۴۰)

بارش سے قبل گھر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اس کی بھرپور تصویر کشی متذکرہ بالا اقتباس میں پیش کی گئی ہے۔ ان کی اس عمدہ جزئیات نگاری نے ان کے کالموں کو اور دلکش بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ہڑپہ کے آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے وہاں کا سفر اختیار کیا۔ عموماً وہ کسی بھی جگہ جب سفر کرتے ہیں تو اس جگہ سے متعلق معلومات کے ہر گوشے پر وہ گہری روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا انداز تخیل بھی عمدہ ہے۔ جس کے سہارے وہ مردہ تصویروں میں جان ڈال دیتے ہیں:

> "مجھے لگا شہر پھر سے جاگ اٹھا ہے۔ دکانیں کھلی ہوئی ہیں، گلیوں میں لوگوں کی چہل پہل ہے، کسان کھیتوں میں کام میں لگے ہیں۔ مچھیرے اپنے جال لیے مچھلیوں کا شکار کر رہے ہیں۔"(۴۱)

ہڑپہ میں انہوں نے تخیل کی پرواز کے طفیل ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مصروف دکھایا ہے۔ انہوں نے قبل مسیح کے منظر کو چشم تخیل سے زندہ کر دیا ہے۔ جہاں آب و دانہ کی خاطر ہر پیشے کے افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی جس بھی علاقے کا سفر اختیار کرتے ہیں وہاں جا کر جو کچھ ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں، اس منظر کی معمولی سے معمولی چیز کو بھی وہ قارئین کے گوش گزار کرتے ہیں۔ انہوں نے جب سکھر شہر کا سفر کیا پھر وہاں پر جزئیات کو سمیٹا وہ قابل تحسین ہے:

> "یہاں مسجدوں کے مینار اور گنبد بھی نظر آتے ہیں اور مندروں کے کلس بھی۔ ایک طرف سکھر بیراج۔۔ اور سرکٹ ہاؤس کی عمارت ہے اور دوسری طرف بوسیدہ عمارتیں، مزار و مقابر ہیں۔"(۴۲)

متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کالم نگار نے جب سکھر کا سفر اختیار کیا تو انہوں نے وہاں جو منظر دیکھا، اسی منظر کو بیان کرنے کا پورا حق ادا کیا۔ جزئیات کو بڑے احسن انداز میں سمیٹا اور تصویر کشی کا پورا حق ادا کیا۔ تقریباً منظر کی تمام چیزیں ہمیں صفحے پر نظر آتی ہیں۔ بغیر کسی تخصیص کے مسجد، مندر، مینار اور کلس ان کی نظر میں بچ گئے۔ پھر ہر طرح کی عمارتیں بھی ان کے لیے جاذب نظر ہیں چاہے وہ نئی ہوں یا پرانی ہوں۔ گویا کالم نگار نے ناول کی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں جزئیات نگاری ایک اہم صفت ہے ،جو کہ ہمیں اُن کالموں میں جابجا ملتی ہے اور جزئیات نگاری ان کے کالموں کو اور بھی جاندار بنا دیتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو تا ہے کہ ان کو جزئیات نگاری میں خاصا شغف ہے۔

۸۔ جذبات نگاری

جذبات نگاری بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا ایک اہم عنصر ہے۔ انہوں نے جہاں پر کسی بھی قسم کے جذبات کی عکاسی کی ہے تو اس کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اس لیے یہ ایک عمدہ اور فنکارانہ چابکدستی ہے کہ ایک کالم نگار جذبات کی ایسی عکاسی کرے کہ وہ جذبات اپنے معلوم ہوں، بلاشبہ یہ ایک کاریگری ہے جو ہمیں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں نظر آتی ہے۔ جب کوئی انسان اپنے بیٹے کو گھر سے رخصت کرتا ہے تو اس کے جذبات کی عکاسی ملاحظہ ہو:

> " اب اس کی فلائیٹ کا وقت ہو گیا ہے اور اپنے لاؤنج کی طرف چلنے لگتا ہے۔ میری آنکھوں کی نمی منظر دھندلا دیتی ہے۔"(۴۳)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے جب اپنے بیٹے کو الوداع کیا تو شدت جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے اس کی عکاسی کالم میں کی ہے کہ کس طرح انسان جب کسی پیارے کو پردیس بھیجتا ہے تو اس لمحے کو برداشت کرنا کٹھن ہے۔

ہمارے ملک کا ایک بڑا طبقہ زراعت سے وابستہ ہے۔ ان کے جملہ امور کا انحصار بارش پر ہی ہے۔ اگر بارش جلدی نہ ہو تو ان کی کیفیت اور جذبات کو شاہد صدیقی صاحب ہی سمجھ سکتے ہیں:

> "گاؤں میں بارشوں کی اپنی اہمیت تھی۔ کسانوں کی فصلوں کا دارومدار بارشوں پر تھا۔ ان کی آنکھیں آسمان پر بادلوں کو تلاش کرتیں اور ہاتھ دعاؤں کے لیے بلند ہوتے۔"(۴۴)

کسانوں کے جذبات کی اس سے بھرپور عکاسی ہمیں کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ گاؤں میں کسان کی زندگی کا دارومدار فصل کے اچھا ہونے پر ہے۔ بعض اوقات بارشیں نہ ہوں تو کسان اضطراب کا شکار رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں آسمان پر بادلوں کو تکتی رہتی ہیں اور ہاتھ دعاؤں کے لیے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن یہی بارش تب ان کے حق میں زحمت ثابت ہوتی ہے۔ جب فصل تیار ہو جائے۔ اس طرح ہر دو حالتوں میں جذبات کی عکاسی عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ جب کبھی انسان کا اپنا کوئی پیارا بیمار ہو یا وہ چلتا پھرتا ہو امحتاج ہو جائے تو یقیناً یہ لمحے بڑے المناک ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ساتھ بھی ہوا جب ان کے بھائی بیمار پڑ گئے وہ جب بھائی سے ملے تو کیا جذبات تھے؟

> "انہیں ویل چیئر پر دیکھ کہ دل دھک سارہ گیا۔ میں نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ نحیف آواز میں مجھے کہنے لگے یہ سب بہت تکلیف دہ ہے۔۔"(۴۵)

ڈاکٹر صاحب کے بھائی جب بیمار پڑ گئے وہ گردوں سے متعلقہ بیماری میں مبتلا تھے۔ ایک دن وہ ویل چیئر پر چلے گئے۔ جب شاہد صدیقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو اس حالت میں دو بھائیوں کے جو جذبات ہوں گے ان کی عکاسی عمدہ انداز میں کی گئی ہے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر ان کے بھائی کی آنکھوں میں خوشی بھی آئی ساتھ ہی انہوں نے اپنے درد کا تذکرہ بھی کیا۔

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں بہت سی جگہوں پر جذبات کو بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے مصائب، خوشی اور فرط کے جذبات کو پورے انہماک سے صفحہ پر لکھا ہے۔

۹۔ سراپا نگاری

سراپا کی شخصیت کے خدوخال اور ظاہری اعضاء اور جسم سے متعلقہ تصویر کا نام۔ یہ ادب کی وہ اصطلاح ہے اس کے لیے گہرا مشاہدہ اور بھرپور مشق درکار ہے۔ اگرچہ شاہد صدیقی صاحب کے کالموں میں سراپا نگاری بہت سی جگہوں پر موجود ہے لیکن اس میں اختصار اور جامعیت ہے۔ کالم چونکہ اختصار کا متقاضی

ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی سراپا نگاری میں اختصار پوری طرح موجود ہے: ''سر پر سیاہ بال، مونچھیں باریک اور ترشی ہوئی اور آنکھوں میں بے پناہ چمک''(۴۶)

مظہر کلیم کی انہوں نے اختصار کے ساتھ ساتھ جامع تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے۔ بال ان کے سیاہ تھے اور آنکھوں میں ہمیشہ امید کی کرن نظر آتی تھی۔ نسوانی حسن کی تصاویر ہماری اردو شاعری کی روایت میں بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ناولوں میں بھی کہیں نسوانی حسن کا سراپا بیان کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اپنے گاؤں میں ایک چھوٹا سا کردار سکینہ تھی انہوں نے سکینہ کے اس کردار کو اپنی سراپا نگاری کے ذریعے اور امر کر دیا:

> '' نام تو اس کا سکینہ تھا لیکن گاؤں میں سب اسے سکینو کے نام سے پکارتے تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت سیاہ آنکھیں، جو سرمے میں اور بڑی بڑی لگتیں، سر پر گھنے بال، ناک میں کوکا اور پاؤں میں کھسہ۔'' (۴۷)

کالم نگار نے سکینہ کی ایک جامع اور عمدہ تصویر پیش کی ہے۔ دیہات کی سادگی اور حسن کی کشش کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا ہے۔ یہ سراپا نگاری کا کمال کہا جا سکتا ہے۔ اپنے والد صاحب سے بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی کو گہرا لگاؤ تھا۔ انہوں نے جابجا اپنے کالموں میں جہاں بھی ان کا حوالہ آیا ہے اس لیے ان کے جذبات کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ والد کا سراپا مختصر اور جامع ہے:

> ''ہمیشہ کی طرح اجلا سفید لباس۔ سر پر پگڑی اور پاؤں میں شان دار موتی کے بنے ہوئے کھسے'' (۴۸)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے والد صاحب کے سراپا کا ذکر متذکرہ بالا کالم میں کیا ہے۔ اس میں ان کے والد کے روایتی اور نفیس لباس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ بچپن کے اساتذہ کے بارے میں ان کے کئی کالم موجود ہیں ۔ آج بھی ان سے متعلقہ یادوں کو انہوں نے پوری طرح سے اپنے دل میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے اساتذہ پر جو بھی کالم لکھے ان میں عمدہ سراپا نگاری موجود ہے۔ اپنے ایک ماسٹر فضل صاحب کا سراپا اس انداز میں پیش کیا ہے: ''دراز قد، سفید رنگ اور سرمئی آنکھیں، چہرے پر ایک جلالی کیفیت ہر وقت طاری رہتی۔''(۴۹)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے استاد کا عمدہ سراپا اس کالم میں پیش کیا ہے۔ ان کے سخت گیر اور بلند قد و قامت ہونے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ان کی اس جلال شخصیت کا نتیجہ تھا کہ سکول کے اندر باہر، طلبہ اور چپڑاسی ان کے سے سہمے رہتے تھے۔ اسی طرح سخت گیری کی عمدہ عکاسی اس کالم میں موجود ہے۔

۱۰۔ تلازمہ خیال

تلازمہ خیال ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں پایا جانے والا ایک اہم فنی عنصر ہے۔ موصوف جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس چیز سے وابستہ اپنی تمام یادوں کو بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ مشاہدہ گہرا ہے اور حافظہ تو بلا کا ہے کہ بچپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی ان کو ابھی تک ازبر ہیں۔

جب وہ سفر کے دوران کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو پھر اسی کے ساتھ یادوں کی ایک طویل زنجیر وابستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح تلازمہ خیال نے ان کے کالموں کو بہت بھرپور بنا دیا ہے جو قاری کے لیے بہت اطمینان بخش ثابت ہوتا ہے۔ قاری کے لیے ان کی یادیں، خیال مزید دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ موضوع سے متعلق معلومات کو بہت جامعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایک کالم نگار میں یہی خوبیاں ہونا ضروری ہیں:

> ”وہ موضوع سے متعلق اپنی تمام تر گہری معلومات کی مدد سے اطمینان بخش دلائل پیش کرتا ہے تفصیل میں کالم نویس ذاتی خیالات پر زور دیتا ہے۔“(۵۰)

ڈاکٹر شاہد صدیقی بھی کتابی معلومات اور اپنی معلومات کو قاری تک پہنچاتے ہیں۔ وہ دراصل موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنی ذاتی معلومات اور مشاہدے کے بیان پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ انکی کالم نویسی میں تلازمہ خیال ایک اہم صفت ہے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے دیکھا کہ بارش لگی ہوئی ہے اور رات کا وقت ہو اچاہتا ہے۔ پھر انہوں نے تلازمہ خیال کے بل بوتے پر گاؤں میں گزرتے ہوئے سنہرے دور کو یاد کیا۔ بڑے احسن انداز میں انہوں نے بچپن کی تمام یادوں کو اپنے کالم میں سمیٹا: ”ہم رات کو صحن میں سو رہے تھے تو بارش ہمیں جگا دیتی۔ ہم بچوں کو والد صاحب ہاتھوں پر اٹھا کر کمرے میں لے جاتے۔“(۵۱)

اس طرح جب انہوں نے بارش کے منظر کو دیکھا ''تو دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' پھر انہوں نے گاؤں کے گزرے ہوئے لمحات کا تذکرہ شروع کر دیا۔ جب والد صاحب ان کو اٹھا کر کمرے میں لے جاتے وہاں پر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی کالم نگار نے اپنے منظر میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے وہاں موجود چارپائیوں کو بھی قاری کی آنکھ کو دکھایا ہے۔ جب کہ انہوں نے بتایا کہ جو چارپائیاں صحن میں رکھی ہوئیں تھیں ان کو بارش سے بچانے کے لیے مکان کی سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تا کہ بارش کے پانی سے بچایا جاسکے۔ پھر بارش سے وابستہ بڑی ہی حسین اور فطری یاد کو انہوں نے بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ بارش کو جب تھوڑی دیر گزرتی تو اندر چھت بھی ٹپکنا شروع کر دیتی۔ گاؤں میں اس زمانے میں مکان کچے ہوتے تھے جو زیادہ بارش کے بعد ٹپکنا شروع ہو جاتے تھے۔ اسی طرح شاہد صدیقی نے بارش کے ساتھ وابستہ تلازمات کو بڑے احسن انداز میں برت کر ایک کالم تخلیق کر دیا۔

موصوف ایک کالم میں تذکرہ کرتے ہیں کہ ایک دن جی۔ ایچ۔ کیو میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انہوں نے تقریب میں شمولیت اختیار کی۔ وہاں آرمی کے ایک افسر مسرور منیر نے اپنے والد کا تذکرہ کیا تو شاہد صدیقی پھر ماضی میں چلے گئے۔

> ''ایک شاگرد بھی یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ اس جملے نے ماضی کے باغ خوش رنگ میں کھلنے والے دریچے کے پٹ وا کر دیئے۔ گزرے ہوئے دن آنکھیں جھپکتے ہوئے جاگ اٹھے۔ دریچے کی اس طرف مجھے اپنے سکول کی عمارت نظر آئی۔''(۵۲)

اس طرح انہوں نے آرمی کے آفیسر کی والد سے وابستہ یاد کو جب سمیٹا تو ساتھ ہی جس سکول میں ان کے والد پڑھایا کرتے تھے اس سکول کی عمارت بھی ان کو اپنی آنکھوں میں نظر آئی۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے تجربات بہت وسیع ہیں۔ انہوں نے کئی ممالک کے اسفار بھی اختیار کیے۔ اس طرح وہ ساتھ ہی اعلی تعلیم کے حصول کے لیے باہر بھی رہے۔ انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے دوران جس چیز کا مشاہدہ کیا اس کو انہوں نے اپنے قاری کو بھی بتایا:

"مجھے یاد ہے جب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے یونیورسٹی آف ٹورنٹو میں زیر تعلیم تھا میری بیٹی ہاجرہ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز ٹورنٹو کے ایک سکول سے کیا۔"(۵۳)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے کینیڈا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے جب کتاب پڑھ رہے تھے تو انھیں یہاں پر کتاب بینی کی ناگفتہ بہ حالت یاد آئی۔ جب کہ اس کے مقابلے میں پائے جانے والے کتاب کلچر کو بھی انہوں نے طشت از بام کیا جو کہ ان کی یاد میں شامل تھا۔

راولپنڈی اور اس کے اطراف میں بھی ان کی یادوں کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ راولپنڈی کے سکولوں، کالجز، یونیورسٹیوں، ہوٹلوں اور پارکوں سے ان کی یادیں وابستہ ہیں۔ لال کُرتی کا ذہن میں آتے ہی ان کے خیال میں ماضی کے خیال نے انگڑائی لی:

"راولپنڈی کی لال کُرتی بھی ایک ایسی جگہ ہے جس کے خیال سے بہت سی یادیں آنکھیں جھپکتے میرے ارد گرد آ بیٹھتی ہیں۔ لال کرتی میری اولین یاد، میرا پرائمری سکول ہے۔"(۵۴)

جب ڈاکٹر شاہد صدیقی تیسری جماعت میں تھے تو وہ لال کُرتی ہی کے سکول میں زیر تعلیم رہے۔ اسی دوران ایک سوال ان کے ذہن میں ہمیشہ گردش کرتا رہا کہ اس جگہ کا نام لال کُرتی کیوں ہے؟ وہ ہمیشہ اس کے بارے میں سوال اٹھاتے تھے۔ پھر آخر کار انھیں اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی کہ یہ کسی زمانے میں برٹش آرمی کا مرکز ہوتا تھا۔ یہاں پر اسی قسم کی یونیفارم تیار ہوتی تھی۔

گاؤں کی یادیں ان کے ذہن میں پوری طرح رچی بسی ہوئی ہیں۔ ان حسین یادوں کو وہ ہمیشہ اپنے دل میں سمو کر رکھنا چاہتے ہیں۔ جب شہر میں وہ چاند رات کو دیکھتے ہیں تو کیسے ان کی یاد بچپن میں پلٹ جاتی ہے:

"میرے سر پر تاروں بھرا آسمان ہے۔ آسمان پر چمکتے ستاروں میں ایک ستارہ سب سے روشن ہے۔ یہ ستارہ مجھے بہت کچھ یاد دلا رہا ہے۔ گاؤں کی وہ چاندنی راتیں جب ہم بچے مگن مٹھی کا کھیل کھیلتے تھے۔"(۵۵)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے چاندنی رات کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ گاؤں کی چاندنی رات بہت دلکش اور دلفریب ہوتی ہے۔ اور یہ چاندنی ایسی ہوتی ہے گویا ہر طرف نور کی برسات ہو رہی ہے۔

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو بھی بعض اوقات یاد کرتے ہیں۔ جب کسی بہانے یا وجہ سے ان کے دوستوں کا نام ان کے سامنے آتا ہے تو اس دوست کے ساتھ گزارے لمحات کا تذکرہ بھی وہ کرتے ہیں۔ اپنے دوست طارق ملک کا نام سن کر ان کے جذبات یا خیالات بھی ان کے پردہ ذہن پر اُمڈ آئے۔ ''یہ ۱۹۸۶ء کا سال تھا جب میں انگریزی میں ماسٹر کے لیے یونیورسٹی آف مانچسٹر گیا۔''(۵۶)

طارق ملک جنہوں نے نادرا میں خوب اصلاحات لائیں۔ ان کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ وہ ایک محب وطن شخصیت تھے۔ بیرون ملک میں ان کے ساتھ گزرے لمحات کو شاہد صدیقی نے ان کی برطرفی کا سن کر یاد کیا ہے۔ یہی تلازمہ خیال کا کمال ہے کہ ان کا قلم اس معاملے میں خاص جوہر دکھاتا ہے۔

۱۱۔ نثر میں شاعری

ادب کی بڑی دو اصناف شاعری اور نثر ہیں۔ آگے ان کو مزید اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے۔ شاعری اور نثر پہلو بہ پہلو بعض اوقات ایک دوسرے کی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ نثر میں شاعری کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ شاعری میں نثر کا استعمال اگرچہ ممکن نہ تھا لیکن اب وہ بھی ممکن ہو گیا کیونکہ نثری نظم کے وجود نے نظم و نثر کے فرق کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کی کالم نگاری کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنے کالموں کو اشعار سے بھی مزین کرتے ہیں۔ ان کا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ بھی کافی وسیع ہے۔ انہوں نے جدید شعراء کو بھی پڑھ رکھا ہے۔

انہوں نے وسیع مطالعہ کیا ہے۔ ان کا یہ مطالعہ ان کے کالموں میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ شاعری سے خوب شغف رکھتے ہیں۔ اپنی بعض باتوں کی مزید وضاحت اور تشریح کے لیے کہیں کہیں

خوبصورت اشعار کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اکثر کالم ہمیں خوبصورت اشعار سے سجے نظر آئیں گے۔ درد کے رشتوں پر ان کے کالم 'تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے' بات چھڑی تو انہوں نے فیض کا مشہور زمانہ شعر بھی اپنے کالم میں ٹانک دیا۔ جس سے کالم کے حسن کو چار چاند لگ گے۔ شعر ملاحظہ ہو:

''بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے''(۵۷)

ان کی منظر نگاری کے اعجاز کا تذکرہ پہلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے خوبصورت تصاویر کو پیش کیا۔ ان کا قلم گویا مصور کا قلم ہے۔ منظر کی جزئیات کو سمیٹ کر اس جامعیت کے ساتھ تصویر تیار کرتے ہیں کہ قاری اس سحر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح انہوں نے سکھر پر کالم لکھا۔ سکھر کے ساتھ ہی دریائے سندھ بہتا ہے۔ جب انہوں نے یہ منظر پیش کیا۔ ساتھ ہی انہیں خوبصورت شعر یاد آگیا:

''نیلا گرم سمندر
اوپر دھوپ کا شیشہ چمکے
موتی اس کے اندر
یاد آئی ہیں باتیں کتنی
بیٹھ کے اس ساحل پر'' (۵۸)

مندرجہ بالا شعر سے دریائے سندھ کے منظر کو کس خوبصورتی کے ساتھ قاری کو دکھایا گیا ہے۔ دریا کو سمندر قرار دینا بھی اپنی جگہ نادر اور انوکھی بات ہے۔ آسمان کے اوپر چمکتا ہوا سورج گویا شیشے کی مانند ہے جس میں دریائے سندھ اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ اس دریا کے کنارے سے وابستہ تمام یادیں بھی آج ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں۔ یہی شاہد صدیقی کے کالم نگاری کا اعجاز ہے کہ انہوں نے نثر میں بھی گویا شاعری کی ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے حوالے کے طور پر اشعار کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا ہے۔

پھر بعض جگہ وہ پورے اشعار کو ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ مختصر مصرع یا آدھا مصرع لے کر بھی اپنا مدعا بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے کالموں میں جابجا مصرع بھی ٹانکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ جانا گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ایسے مصرعے ہمیں ان کے کالموں میں نظر آتے ہیں۔

اپنے بھائی کی بیماری کے بعد وہ قدرے پریشان ہوئے۔ کیونکہ بھائی کے ساتھ وہ گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے بلکہ وہ اپنے بھائی کو جب یاد کرتے ہیں تو ان کی زبان پر اکثر ایک شعر آ جاتا۔ بھائی کے بارے میں جب انہوں نے کالم لکھا تو ناصر کاظمی کا یہ شعر بھی اپنے کالم میں سجا لیا:

؎ دوستوں کے درمیان

وجہ دوستی تم ہو [۶۰]

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اپنے کالموں میں موزوں اشعار کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کا ادبی ذوق عمدہ، مطالعہ وسیع اور سوچ طبق ہے۔

تحقیق کرنے کے بعد یہ امر عیاں ہوا ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں فنی محاسن بڑی خوبصورتی سے پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کالموں میں اختصار سے کام لیا۔ یہ اختصار دراصل کالم نگاری کا تقاضا ہے کیونکہ صحافی تحریر میں اتنی گنجائش موجود نہیں ہوتی کہ اس کو مقابلے کی طرح پھیلا کر رکھا جائے۔ اس لیے اختصار بنیادی شرط ہے جس پر ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم کھرے اترتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے کالموں میں جزئیات کو بڑے احسن انداز میں سمویا ہے۔

منظر کی مکمل تصویر کے لیے انہوں نے چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو ملا کر ایک جامع، اکمل اور کامل تصویر قاری کو دکھائی ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فطرت نگاری میں ان کے قلم کا جوہر اور بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ سراپا نگاری میں بھی ان کا جواب نہیں۔ انہوں نے سراپے بہت عمدہ تراشے ہیں لیکن ان سراپوں میں اختصار نمایاں ہے۔

تحقیق کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے فنی لوازمات ان کو ادب کی ذیل میں لے آتے ہیں۔ ان کے کالموں میں کہانی پن نمایاں ہے۔ کسی بات کو بیان کرنے یا پھر قاری کو اسی سے آگاہ کرنے کے لیے وہ بیانیہ انداز اپناتے ہیں اسی بیانیہ انداز میں ایک خاص تسلسل ہوتا ہے۔ اختصار بھی ان کے کالموں کی اہم خوبی ہے کالموں میں اختصار کا ہونا لازمی امر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں لمبے چوڑے واقعات و حالات کو بیان کر کے کالم کے فنی لوازم پورے کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں فصاحت و بلاغت کا عنصر بھی نمایاں ہے جیسے واقعات کی نوعیت ہوتی ہے ویسے ہی الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں۔

منظر نگاری بھی ان کے کالموں کا لازمی حصہ ہوتی ہے جو تصویر وہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسے الفاظ کا روپ دے کر قاری کے سامنے ہو بہ ہو وہی منظر پیش کرتے ہیں۔ دلچسپی کا عنصر بھی ان کے کالموں میں پایا جاتا ہے جو قاری کو مزید پڑھنے پر اکساتا ہے۔ تخلیق کار فطرت سے گہرا شغف رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں میں جابجا مناظر فطرت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ جب ڈاکٹر شاہد صدیقی کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو جزئیات نگاری کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو منظر کا حصہ بناتے ہیں جس سے جامع تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

تحقیقی نکتہ نظر سے جہاں تک کسی بھی حالت کے جذبات کا تعلق ہے تو وہ جذبات نگاری کا حق بھی بخوبی ادا کرتے ہیں۔ جذبات کے متعلق انداز کو فنکارانہ انداز میں قلمبند کرتے ہیں۔ کسی شخصیت کے خدوخال کو پیش کرنا ہو تو وہ ایک ماہر مصور کی طرح الفاظ کے خوبصورت پیرائے میں اس شخصیت کا سراپا بیان کرتے ہیں۔ ناول اور افسانے کی اہم خصوصیت تلازمہ خیال کو بھی انہوں نے اپنے کالم میں برتا ہے۔ کسی شخص یا جگہ سے متعلقہ تمام واقعات کو وہ اپنے کالموں میں بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ گہرا ہے وہ شعر و شاعری سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو کالموں میں موقع کی مناسبت سے اشعار کا خوبصورت استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح ان کے کالموں میں متذکرہ بالا تمام تر فنی لوازم بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں جو ان کے کالموں کو ادب کے قریب کر دیتا ہے۔

تحقیق کرنے کے بعد جو بات میرے سامنے آئی ہے اُس کے مطابق اُن کے کالموں میں متذکرہ تمام ترفنی لوازم بدرجۂ اُتم پائے جاتے ہیں وہ مناظر فطرت کے مطابق خوبصورت زبان و بیان کا بر محل استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کالموں میں ہمیں جو بیانیہ انداز دکھائی دیتا ہے اُس میں ایک خاص تسلسل ہوتا ہے جو کہ انھیں معاصر کالم نگاروں سے جدا کرتا ہے۔ اختصار اُن کے کالموں کا ایک بہت فنی وصف ہے جس کی بدولت وہ انتہائی مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنی بات کو قاری تک پہنچاتے ہیں جس سے قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا لہٰذا اختصار جیسی فنی خوبی کو اُنھوں نے بخوبی اپنے کالموں میں برتا ہے۔ فصاحت و بلاغت جیسے فنی لوازمات بھی اُن کے کالموں کی خاصیت ہیں۔ وہ حالات و واقعات کو نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اپنے قارئین کے گوش گزار کرتے ہیں۔ جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے تو یہ وہ فنی لوازم ہے جسے ہر لکھاری نہایت عمدگی سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہی انداز ہمیں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں بھی ملتا ہے۔ تحقیق کے دوران یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں منظر کشی بہت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے جس سے قاری کو کالم پڑھتے ہوئے پیش کیا گیا منظر آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے لہٰذا منظر نگاری بھی اُن کے کالموں میں دلچسپی کا موجب بنتی ہے اور قاری اس فنی خوبی سے خوب لطف اندوز ہو کر کالم پڑھتا ہے۔

تجسس ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا ایک ایسا عنصر ہے کہ جس کی بدولت اُن کے کالم پڑھنے کے لیے قاری مجبور ہو جاتا ہے یعنی اُن کے کالموں میں تجسس جیسی فنی خوبی بھی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کی ایک فنی خوبی فطرت نگاری ہے۔ مجوزہ تحقیق کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کے تقریباً تمام تر کالموں میں فطرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جزیات نگاری کے ذریعے آپ کسی بھی منظر کو فنکارانہ چابکدستی سے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری ایسا محسوس کرتا ہے جیسے وہ کالم میں متذکرہ تمام چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے تو جذبات نگاری ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اہم جزو ہے ان کے کالموں میں جذبات کی عکاسی کا حق پوری طرح سے ادا کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے کالموں میں تمام ترفنی لوازمات کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ جذبات نگاری ہو یا جزئیات

نگاری، تلازمہ خیال ہو یا منظر نگاری، فصاحت و بلاغت ہو یا تجسس کا انداز، سراپا نگاری ہو یا نثر میں شاعری کا استعمال ہو، ڈاکٹر شاہد صدیقی نے تمام تر فنی لوازمات کو نہایت ہی احسن انداز سے اپنے کالموں میں برتا ہے جس کی بدولت قاری ان کے کالموں کو دلچسپی سے پڑھتا ہے اور بے صبری سے اُن کے نئے کالم کا انتظار کرتا ہے۔ متذکرہ بالا تمام تر فنی لوازمات کی بدولت یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم اپنے اندر ادب کے فنی لوازمات کی چاشنی لیے ہوئے ہیں یعنی یہ تمام تر کالم ادب کے رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مجوزہ تحقیق کے تمام تر کالم ادب کے قریب تر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکول اور سزا، روح کے زخم کون دیکھے (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء ص ۱۱۴

۲۔ شاہد صدیقی ، ڈاکٹر ، پنجابی زبان اور معاشرتی رویہ ، (کالم) مطبوعہ :روزنامہ دنیا ،اسلام آباد ، ۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۳۔ شاہد صدیقی ، ڈاکٹر، مارچ کا مہکتا مہینہ اور ملتان کا مظفر خان، (کالم)، مطبوعہ: دنیا، اسلام آباد ، ۱۳ مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، حیرت کدہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ مئی ۲۰۲۸ء، ص ۱۱

۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آج یاد تم بے حساب آئے، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۷ اگست ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱

۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ماسٹر فضل صاحب، مطبوعہ (کالم): روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۷ نومبر ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱

۷۔ امینہ سید، تمنا کا دوسرا قدم، مطبوعہ (کالم): روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۸ جنوری ۲۰۱۹ء، ص، ۱۱

۸۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر، کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان: اسلام آباد، طبع اول ۱۹۹۸ء، ص، ۴۲

۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، اتنبول: یہ رشتہ و پیوند، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص، ۱۱

۱۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ہڑپہ: یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳ فروری ۲۰۱۸ء، ص، ۱۱

۱۱۔ شاہد احمد صدیقی، ڈاکٹر، منو بھائی، تمہارے نام پر آئیں گے غم گسار چلے (کالم) مطبوعہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۴

۱۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بھٹو صاحب، یہی بہار کے دن تھے کہ سرخ رو ہوئے ہم، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳اپریل ۲۰۱۸، ص ۱۱۲

۱۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سرسید کالج: گہرے رنگوں اور مسحور کن خوشبو کا زمانہ، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، ۵ جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۱۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، مارچ کا مہکتا مہینہ اور ملتان کا مظفر خان (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، ۱۳مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۱۵۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، بار اول ۲۰۱۵ء، ص ۳۶

۱۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، قونیہ: رومی اور شمس کا شہر (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۷اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۱۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکول اور سزا: روح کے زخم کون دیکھے (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۱۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، مارچ کا مہکتا مہینہ اور ملتان کا مظفر خان (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۱۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، راولپنڈی کی لال کُرتی (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، استنبول: یہ رشتہ و پیوند (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۰ مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۲۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، استنبول: یہ رشتہ و پیوند (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۰ مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۲۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، رائے احمد خان کھرل: پنجابی مزاحمت کا استعارہ (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۶ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بارش، کافی اور کتاب (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۱ اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سرسید کالج: گہرے رنگوں اور مسحور کن خوشبو کا زمانہ (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۵ جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلیانوالہ: پنجابی مزاحمت کا آخری مورچہ (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳ جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آج تم یاد بے حساب آئے (کالم)، مطبوعہ اسلام آباد ۷ اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلیانوالہ: پنجاب کی پہلی مزاحمت (کالم)، مطبوعہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۱۱

۲۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، قونیہ: رومی اور شمس کا شہر (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۳۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بریڈلال ہال، آخر شب کے ہمسفر، فیض نہ جانے کیا ہوئے (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۹ دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴

۳۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، حیرت کدہ (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلیانوالہ، پنجابی مزاحمت کا آخری مورچہ (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳ جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، امینہ سید، تمنا کا دوسرا قدم (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۸ جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۱

۳۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، گاؤں، بچپن اور بارش؛ ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۳۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکھر، دریائے سندھ کا ہمراز (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۷ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سنگھوری سے تل پترا کی بلندیوں تک (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ ستمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خود احتسابی (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۱ مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکول اور سزا، روح کے زخم کون دیکھے (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۳۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بھٹو صاحب: یہی بہار کے دن تھے کہ سرخرو ہوئے ہم (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳ اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، گاؤں بچپن اور بارش، (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۴۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ہڑپہ: یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکھر: دریائے سندھ کا ہمراز، (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۷ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، یہ رشتہ و پیوند (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۰ مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۴۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، گاؤں بچپن اور بارش، (کالم)، مطبوعہ؛ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۴۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۳ مئی ۲۰۱۸ء ص ۱۱

۲۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، مظہر کلیم: پھر کب ملیں گے (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۹ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکینہ کالم، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۴ نومبر ۲۸ء، ص ۱۱

۴۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آج تم یاد بے حساب آئے (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ: دنیا، اسلام آباد، ۷ اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۴۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ماسٹر فضل صاحب (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲ نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۰۔ سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۳۲۲

۵۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، گاؤں، بچپن، مطبوعہ، روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱

۵۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خواب خوش رنگ میں کُھلتا دریچہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بارش کافی اور کتاب (کالم) مطبوعہ روزنامہ: دنیا اسلام آباد، ۱۰ اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، راولپنڈی کی لال کُرتی، کالم، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۶ جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آج تم یاد بے حساب آئے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۷ اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، طارق ملک: اے اہل زمانہ قدر کرو (کالم)، مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۸ دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، منو بھائی: تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۳۰ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکھر: دریائے سندھ کا ہمراز، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۷ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۵۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

باب سوم:

شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب اور ان میں نثری اصناف کا رنگ تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم در اصل ادب سے جدا نہیں ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے وہ جہاں پر ادبی اصطلاحات کا خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں وہاں پر ان کے کالموں میں ہمیں مختلف نثری اصناف کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس باب میں ان کے کالموں کے اسلوب پر بھی نگاہ ڈالی جائے گی اور ان خصائص کو سامنے لانے کی سعی کی جائے گی جن کے طفیل ان کے کالم ادبی فن پارے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

الف: اسلوب کے بنیادی مباحث

اسلوب ایک ایسا موضوع ہے جن پر لکھاریوں نے خوب لکھا ہے۔ یہ ایک وسیع اور جامع موضوع ہے۔ صرف اس موضوع پر عابد علی عابد نے کتاب رقم کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف ناقدین اور محققین نے اپنے اپنے انداز سے اس موضوع پر اوراق سیاہ کیے ہیں۔ اسلوب کیا ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی مبادیات کیا ہیں اور اس کی اہمیت پر بحث کی جاتی رہی۔ عابد علی عابد نے اسلوب کے بارے میں دو جملوں میں مختصر اور جامع بحث کرتے ہوئے کہا: ''اُسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔''(۱)

اسلوب در اصل ایک ایسی چیز ہے جو کسی بھی لکھنے والے کو دوسروں سے الگ پہچان دلواتی ہے۔ ہر شخص کی سوچ اور مطالعہ ذاتی ہوتا ہے۔ یہ چیزیں اس کو دوسروں سے الگ اور منفرد بناتی ہیں۔ اسلوب دراصل کسی بھی شخصیت کا ذاتی اظہار ہے جو کہ اس شخص کی خوبیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اسلوب میں ہمیں شخصیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے طفیل وہ اپنی الگ راہ نکالتا ہے، کبھی وہ آزاد اور کبھی وہ اقبال اور کبھی مشتاق

احمد یوسفی کی شکل میں ایک اعلیٰ پائے کا لکھاری سامنے آتا ہے۔ گویا اسلوب مصنف کی پہچان ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ اسلوب ہی مصنف ہے۔ بلکہ اسلوب کے بارے میں حسن عسکری نے اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ:

"اُسلوب خارجی حالات یا ماضی اور حال کا عکس ہی سہی لیکن ساتھ ہی ساتھ نئے اسلوب کی دریافت ایک نئے مستقبل کی تعمیر ہے۔"(۲)

گویا اسلوب پر کسی شخص کا اثر ضرور ہو سکتا ہے۔ اسلوب کو جاذب نظر اور دلچسپ بنانے کے لیے ماضی کے لکھاریوں کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہوتا ہے ان لکھاریوں نے ماضی میں کسی نہ کسی جگہ ادب میں ایک بڑا کام کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص کلاسیکی ادب سے فرار اختیار کر کے ایک اچھا اور بڑا لکھاری قطعی نہیں بن سکتا بلکہ اس کے لیے ایک بڑے ریاض اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ جب کوئی ادیب ایک عمدہ فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کا وہ فن پارہ اور اس میں استعمال شدہ اسلوب آنے والے لکھاریوں کے لیے نشان منزل کا کام کرتا ہے۔

ہر رنگ کی تحریر اپنا الگ اسلوب رکھتی ہے۔ داستان کے اسلوب کا اپنا انداز ہو گا۔ افسانہ اپنے لیے الگ اسلوب کا متقاضی ہے۔ انشائیہ کا ڈھنگ اور ہے اور اسی طرح کالم کا اسلوب بھی اپنے لیے الگ راہ نکالتا ہے۔ کالم کی اقسام کے مطابق کالم کا اسلوب بھی بدلتا ہے۔ جس طرح کام کی کئی اقسام ہیں اسی طرح اسلوب بھی ہر قسم کے ساتھ اپنا اپنا رنگ سامنے لاتا ہے۔ اسلم ڈوگر نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

"ہر کالم کا اسلوب بھی مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی کالم نویس کسی مزاحیہ موضوع پر قلم اٹھائے تو کالم نویس جب تفریحی کالم لکھے گا تو اس کا اسلوب یقیناً مختلف ہو گا۔"(۳)

اس طرح کالموں کی اقسام کے ساتھ اسلوب بھی نئی جہت سامنے لائے گا۔ اسلوب کے لیے کئی عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ ادیب جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کے پاس ایک واضح سوچ ہوتی ہے۔

وہ کسی ایک سوچ کے تابع ہوتا ہے۔ پھر وہ الفاظ کا چناؤ کرتا ہے۔ اس کے پاس ذخیرہ الفاظ میں سے فصاحت اور بلاغت کا خیال رکھتے ہوئے وہ عمدہ اور بہترین الفاظ کا چناؤ کرتا ہے پھر ان الفاظ کو استعمال کرنے کی باری ہے۔ اس میں بھی بہت احتیاط اور فن کاری کی ضرورت ہوتی ہے پھر ان پیش کردہ خیالات میں ایک تسلسل اور ربط بھی ہونا چاہیے۔ ان چار عناصر کے ملنے سے اسلوب کا وجود بنتا ہے۔ گویا ان چار عناصر کے بغیر ہم اسلوب کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ دراصل اسلوب کا زیادہ تر استعمال ادب میں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مرزا خلیل بیگ کی رائے درست معلوم ہوتی ہے۔

> "اسلوب کا ادب کے ساتھ گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آج اسلوب سے مراد ادبی زبان مراد لیتے ہیں اور اسلوب کو اچھی موثر اور خوبصورت تحریر کی خصوصیت سمجھتے ہیں۔"(۴)

اسلوب کا زیادہ تر اطلاق ادبی تحاریر پر ہوتا ہے۔ ہم ادب کے میدان میں کسی ادیب اور فن کار کے اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بلکہ اسلوب ہی تحریر کو ادبی بناتا ہے۔ اس طرح اسلوب اور ادب میں گہرا ربط اور تعلق موجود ہے۔ دراصل اسلوب سے مراد ہی ادب کی زبان لی جاتی ہے۔ جو تحریر کو جاذب نظر اور دلکش بنا دیتی ہے۔ یہ لکھاری اور قاری دونوں کے لیے مسرت کا باعث بنتی ہے۔ اسلوب کے اچھا ہونے میں ہی فن پارہ اچھا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اسلوب اور ادب کا آپس میں گہرا ربط ہے۔

اب اسلوب صرف تنقید کی ایک اصطلاح ہی نہیں بلکہ تنقید کا ایک انداز ہے۔ جو جدید عہد میں ہمیں جامعات میں اس کا استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رابعہ سرفراز نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ لفظ ایک ادبی اصطلاح ہی نہیں تنقیدی موضوعات میں ایک جداگانہ فن کا درجہ رکھتا ہے۔"(۵)

اس طرح اسلوب سے ہی اب ہم نے اسلوبیات کی ایک نئی اصطلاح تراشی ہے جس میں کچھ لسانی قواعد کی رو سے ہم ادب پارے کی جانچ اور پرکھ کرتے ہیں گویا یہ اسلوب ایک اصطلاح ہی نہیں رہی بلکہ ایک تنقیدی تھیوری (Theory) بن چکی ہے۔ اسلوب دراصل فنکار کا اپنا اظہار ہے۔ رشید امجد نے لکھا ہے: "اسلوب ذات اور شخصیت کا اظہار ہے۔"(۶)

اسلوب در اصل فن کار کا اپنی ذات کا اظہار ہے۔ کسی پیچیدہ شخصیت کا اسلوب بھی پیچ دار ہو گا جب کہ اس کے مقابلے میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ شخصیت کا کھرا پن اس کی تحریر میں جھلکتا ہے۔ گویا اسلوب ذات اور شخصیت کا بہترین اظہار کہا جا سکتا ہے۔

ب: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب

ڈاکٹر شاہد صدیقی دور حاضر کے ایک اہم کالم نگار ہیں۔ وہ ہمارے سامنے کئی حیثیتوں سے سامنے آتے ہیں۔ماہر تعلیم ہونے کے ناطے بھی ان کے کالموں میں جان پائی جاتی ہے کیونکہ وہ ہمارے تعلیم کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی اپنے کالموں کے ذریعے کرتے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ جہاں انھوں نے غالب کو گہرائی کے ساتھ پڑھ کر اس کی شوخی کو اپنایا ہے وہاں انھوں نے اقبال کے فلسفے کو بھی کھنگالا ہے۔ انھوں نے ماضی کی تقریباً تمام نمائندہ تصانیف کو پڑھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب جاذب نظر اور ادبی چاشنی لیے ہوتا ہے۔ان کے کالم اسلوب کے طفیل بڑی آب و تاب کے ساتھ ادب کی سرحدوں میں داخل ہیں۔ انھوں نے باغ و بہار جیسے کلاسیکی فن پارے کو بچپن میں پڑھ ڈالا تھا۔ بچپن کا ماحول ادبی تھا جن کے مثبت اثرات اُن پر مرتب ہوئے پھر انھوں نے انگریزی ادب ہی میں اعلیٰ سطح کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے دور طالب علمی میں اعلیٰ پائے کی درس گاہوں سے فیض یاب ہوئے۔ پھر انھوں نے ادب کا بھی اس دوران گہرائی سے مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں ایک خاص جاذبیت اور کشش موجود ہے جو قاری اور لکھاری دونوں کے لیے فرحت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی خود ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب پرور بھی ہیں۔ انھوں نے مختلف ادباء کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ انھوں نے اعلیٰ پائے کی کانفرنسز منعقد کیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب سے گہرا ربط اور تعلق ہے۔ اس طرح ان کا یہ لگاؤ موصوف کے اسلوب میں جھلکتا ہے۔ کالم کا اسلوب بڑا بے تکلف ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی بناوٹ اور رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا۔ بلکہ آسان زبان میں اپنی بات بیان کر دی جاتی ہے۔ حتی الوسیع کوشش کی جاتی ہے کہ زبان سادہ رہے تاکہ عوام میں موجود نچلے ذہن کا قاری تحریر کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ سکے۔

"کالم عموماً ایسے لکھا جاتا ہے جیسے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگائی جارہی ہو۔ اس میں تکلیف سے پرہیز ضروری ہے اور اپنائیت کے احساس کو اس کی خوبی قرار دیا جاتا ہے۔"(۷)

اسی طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی بھی اپنے کالموں میں بڑے بے تکلف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ان کے کالموں کا انداز ایسے ہی ہے جیسے دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے بے تکلف باتیں ہو رہی ہوں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں سادہ، عام فہم زبان کا استعمال نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں بات کو بہتر انداز میں پیش کرنے اور مفہوم کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھانے کے لیے کالموں میں تشبیہات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ تشبیہات کا بے تکلف انداز ان کے ہاں ملتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تکلف اور بناوٹ نظر نہیں آتی بلکہ کمال فن کاری اور چابکدستی سے تشبیہات کا استعمال ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ وہ ایک چیز کی صفت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اپنے کالموں میں تشبیہ لاتے ہیں جس کی وجہ سے متذکرہ چیز کی صفت اور خوبی زیادہ نکھر کر قاری کے سامنے آتی ہے۔ اب ان کا انداز بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

"اگر کنٹرول سے مراد ایک ایسی کلاس ہے، جہاں قبرستان کی سی خاموشی ہے۔۔۔۔تو ایسا کنٹرول کسی طور استاد کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔"(۸)

ماہر تعلیم ہونے کے ناطے انھوں نے مختلف تعلیمی اداروں کے دورے کیے۔ ایک کلاس میں وہ بیٹھے تو کلاس میں حد سے زیادہ خاموشی تھی۔ جس کی وجہ طلبہ سہمے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ایسی خاموشی کو قبرستان جیسی قرار دیا۔ اس پر انھوں نے تنقید بھی کی ہے۔ ایسی کلاس یا ایسے نظم وضبط اور کنٹرول کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ جہاں استاد کی ہاں میں ہاں ملائی جائے اور کسی طالب علم کو سوال کرنے کی جرات نہ ہو۔ ایسی خاموشی اور ڈسپلن بیکار ہے۔ اس کیفیت کی وضاحت کے لیے ایک عمدہ اور نادر تشبیہ کو انھوں نے اپنے کالم میں استعمال کیا ہے۔

بعض اوقات سوالیہ انداز کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ وہ اس انداز سے سوال پوچھتے ہیں کہ قاری مزید سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں استفہامیہ انداز نے کالموں کے اندر دلچسپی کے عناصر بھی پیدا کر دیے ہیں۔

"زبان کا تصور کیا ہے؟ زبان اور اس کے بولنے والوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟۔"(۹)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے یہ استفہامہ انداز اس لیے اپنایا ہے کہ اس کی تکنیک کے ذریعے وہ موضوع کے نئے گوشے قاری کے سامنے لاتے ہیں بلکہ ان کا یہ استفہامیہ انداز ہمیں مزید سوچنے پر اکساتا ہے۔ زبان کے تصور کے بارے میں بھی طرح طرح کے سوالات سننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مصنف نے بھی مندرجہ بالا اقتباس میں زبان کے بارے میں کچھ ضروری سوالات اٹھائے ہیں۔ یہاں پر ایک سوال اٹھایا ہے کہ زبان اور اس کے بولنے والوں کے مابین کیا تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک نکتہ آفریں سوال ہے۔ اس طرح استفہامہ انداز ہمیں مزید سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں الفاظ کا چناؤ بہت عمدہ ہے۔ کالم نگار کے پاس الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہوتا ہے۔ وہ اس میں سے اچھے الفاظ کا چناؤ کرتا ہے اور پھر ان کا استعمال کرتا ہے۔ محبت کے بارے میں انھوں نے کیسے الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔ وہ ایک کالم میں لکھتے ہیں کہ:

"محبت بھی کیسا جذبہ ہے جو ہر منطق اور منعقت سے بے نیاز ہے۔ اسے بس محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو خوش رنگ پھولوں میں بسی خوشبو کا جھونکا ہے۔"(۱۰)

متذکرہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کس فنی خوبی اور کمال ہنری مندی سے جذبہ محبت کی توضیح و تشریح کی ہے۔ ان کا یہ انداز تکلم جو انھوں نے محبت جیسے نرم اور ملائم لفظ کی وضاحت کے لیے ایسے شیریں الفاظ کا استعمال کیا ہے کہ محبت خوش رنگ پھولوں میں بسی خوشبو کا نام ہے۔ آگے چل کر محبت میں

تحریک کے پہلو کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ محبت سر سبز وادیوں میں بسنے والا جھرنا ہے۔ اس جملے سے محبت کے اندر پائے جانے والا تحرک کا پہلو واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں خوبصورت محاورات کو بھی استعمال کیا ہے جو ان کی تحریر کو مزید دلکش اور خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ "وہ بھی کیا دن تھے پلک جھپکتے ہی ہوا ہو گئے۔"(۱۱)

مندرجہ بالا اقتباس محاورے کا استعمال خوب بر محل اور برجستہ ہے۔ انھوں نے اپنی کالم نگاری کو اور خوبصورت بنانے اور زبان کو سنوارنے کے لیے محاورات کا استعمال بھی فن کاری سے کیا ہے۔ قاری ان کی فنی مہارت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے راولپنڈی کی کئی مشہور درسگاہوں میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ تعلیمی جماعتوں تک تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے لال کُرتی کے سکول میں بھی کچھ دن مطالعہ کیا۔ پھر سرسید کالج اور گورڈن کالج ان کی درسگاہیں بنیں وہاں گزرے شب و روز کو جب وہ یاد کرتے ہیں تو ان کا قلم موتی پروتا ہے۔ اپنے رومانوی دنوں کو یاد کرتے ہوئے ان کا قلم جواہر نگار بن جاتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ قابلِ تعریف ہے۔ اُن کے ایک کالم کے اقتباس ہی سے ان کے الفاظ کی رنگینی اور چاشنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> "یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب صبحیں بہت اجلی اور شامیں رنگوں میں ڈوبی ہوتی تھیں۔ جب پھولوں کے رنگ بہت گہرے اور ان کی خوشبو مسحور کُن ہوتی تھی یا پھر مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا۔"(۱۲)

ڈاکٹر شاہد صدیقی اپنے دور طالب علمی کو یاد کرتے ہوئے ایسا رنگ اختیار کر لیتے ہیں کہ قاری بھی اس دور کا حصہ بننا چاہتا ہے۔ سرسید کالج میں گزرے ان کے شب و روز ان کے تعلیمی دور کا ایک شاندار اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔ وہ جب بھی ماضی کے صفحات کو پلٹتے ہیں تو ان کے ہاں ایک ایسا دلکش انداز در آتا ہے جس کا نمونہ ملنا مشکل ہے۔

یہ بے نظیر انداز کئی کالموں میں جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سر سید کالج ہی کو یاد نہیں کرتے بلکہ گورڈن کالج کے دور کو بھی وہ سنہری حروف میں یاد کرتے ہیں۔ ان کے کئی کالم ان کے تعلیمی دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ کبھی وہ درسگاہ کی منظر نگاری کرتے ہیں اور کبھی درس گاہ سے جڑی چیزوں اور لوگوں کو ایسے شیریں الفاظ میں یاد کرتے ہیں کہ ان کا اسلوب پختہ تر اور معنی آفریں معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے تشبیہات و استعارات کو بھی اپنے ہاں برتا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی صفات کو وہ تشبیہات و استعارات سے مزید اجاگر کرتے ہیں۔ ایک کردار سکینہ بھی ان کے ایک کالم کا موضوع بنی۔ اس کی شخصیت کو انھوں نے احسن انداز میں بیان کیا ہے:

> "سکینہ ایک جنگلی پرندے کی مانند تھی۔ آزاد ہواؤں کی عادی جس کی پرواز کُھلی فضاؤں میں تھی۔ سب سوچ رہے تو جب یہ پرندہ شادی کے پنجرے میں آئے گا تو کیسے کھلے آسمان کے لیے پھڑ پھڑائے گا۔ "(۱۳)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں کی زبان سادہ اور عام فہم رکھی ہے۔ انھوں نے بر محل اور برجستہ تشبیہات کا استعمال کیا ہے جن کے طفیل عبارت میں ایک خاص چاشنی اور لطیف سی کیفیات پیدا ہوتی ہے۔ ان کے گاؤں کا دور فطرت کے بہت قریب تھا۔ اس دور کی یادوں کو انھوں نے خوب سمیٹ کر رکھا ہے۔ پھر ان یادوں کو خوب فنی مہارت کے ساتھ اپنے کالموں میں استعمال بھی کیا ہے۔ ان کی زبان عام فہم، سادہ اور رواں ہے۔ انھوں نے متذکرہ بالا اقتباس میں اپنی زبان کو کردار کی زبان کے قریب رکھا ہے۔ یعنی جیسا سادہ کردار انھوں نے تراشا ہے ایسی ہی زبان کا استعمال بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے اور اس اقتباس میں مراۃ النظیر کا بھی عمدہ استعمال کیا ہے۔ سکینہ کو ایک جنگلی پرندہ قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ کئی تلازمات بھی لے کر آتے ہیں۔ ان کے کالموں کی زبان سادہ ہے۔ یہ کالم نگاری کا تقاضا بھی ہے کیونکہ کالم عام پڑھے لکھے قارئین کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے تقاضوں کو موصوف نے بخوبی نبھایا ہے۔ بے شک ان کا اسلوب ان کے کالموں کو مزید چار چاند لگا دیتا ہے۔

ج: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ادبی اصناف کا رنگ

جب ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی ظاہری ہیت سے ہی کئی ادبی اصناف کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادب کی چند بڑی نثری اصناف کا زائقہ ان کے کالموں کے ذریعے لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کالموں میں خشک، پیچیدہ اور گنجلک اصطلاحات سے دور رکھتے ہوئے صاف اور شستہ زبان میں ادب کے قریب رکھا ہے۔ ادب کی بیشتر اصناف کے رنگ ان کے کالموں میں نظر آتے ہیں۔ ان کا کلاسیکی ادب کا مطالعہ گہرا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ذہن رسا کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ مشاہدے کی بھرپور صلاحیت سے لیس ہیں۔ اپنے کالموں کے مواد کو حاصل کرنے کے لیے خوب محنت اور جدوجہد کرتے ہیں۔ کالموں کو مزید معلوماتی اور ادبی بنانے کے لیے دور دراز کے سفر بھی اختیار کرتے ہیں۔ پھر کئی کالموں پر سفر ناموں کا گمان گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں کو بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ تمام ذہنی سطحوں کے قاری ان کے کالموں کا مطالعہ کر کے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ آئندہ آنے والے صفحات میں ان کالموں میں ادبی اصناف کا جو رنگ جھلکتا ہے۔ اس کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

i۔ سفر نامہ نما تحریریں

سفر نامہ دراصل سفری تجربات و مشاہدات کے بیان کا نام ہے۔ سفر نامہ ہمیں کسی بھی دیس، علاقے اور ملک کے متعلق معلومات بھی فراہم کرتا ہے بلکہ بعض مصنفین کے قلم کا اعجاز اس قدر عمدہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں شریک سفر بھی کرتا ہے۔ سفر نامہ سفر کے دوران بھی لکھا جا سکتا ہے اور منزل پر پہنچ کر بھی رقم کیا جا سکتا ہے۔ صبیحہ انور سفر نامے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جسے مسافر سفر کے دوران یا منزل پر پہنچ کر اپنے تجربات اور مشاہدات کی مدد سے تحریر کا جامہ، پہناتا اور اپنی گزری ہوئی کیفیات سے دوسروں کو واقف کراتا ہے۔“(۱۴)

گویا سفر نامہ ایک ایسی تحریر ہے جو سفر کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آتی ہے۔ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں بہت سے کالم ایسے ہیں جن پر سفر ناموں کا گمان گزرتا ہے۔ ان کالموں میں مختلف دیار کی سیاحت اور اس علاقے کی معلومات کو موصوف نے اپنے کالموں میں پوری طرح رچابسا کر اپنے کالموں کو ادب کی دنیا میں لے آئے ہیں۔ انھوں نے مختلف کالموں میں سفر نامہ کے عناصر کو سمویا ہے۔ان کا ایک قونیہ: رومی اور شمس کا شہر، پوری طرح سفر نامے کی ذیل میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے ترکی کا سفر کیا اور قونیہ شہر کو اپنی چشم بینا سے دیکھا وہاں کے تجربات کو اپنے کالم میں احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ قونیہ ایک تہذیبی، تعلیمی اور تاریخی شہر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے جہاں رومی اور شمس نے اپنے شب و روز گزارے۔ان کی تحریر سے

عیاں ہوتا ہے کہ ان کو اسی شہر سے گہرا لگاؤ اور عقیدت ہے۔ یہاں پر ان کے قلم نے خوب جوہر بکھیرے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”ترکی کا شہر قونیہ استنبول سے بالکل مختلف ہے۔ اس کو صوفیا کا شہر کہا جاسکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی پہچان کہ یہ رومی کا شہر ہے۔“(۱۵)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ترکی کے سفر کے تجربات کو مذکورہ بالا کالم کے ذریعے اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے سفر نامے کے سارے تقاضے پورے کیے ہیں۔ دراصل وہ اپنے بیٹے سے ملنے ترکی گئے۔ ترکی سے ان کا گہرا لگاؤ بھی ہے۔ انھوں نے قونیہ شہر میں قیام کیا۔ان کا مسکن رومی کے مزار کے قریب ہی تھا۔ ہمیں قربت کا احساس ان کے کالم میں بھی نظر آتا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے ہوٹل کے کمرے میں اپنا سامان چھوڑا اور رومی مزار کی جانب چل دیے۔ سب سے پہلے انھوں نے رومی کے مزار کی زیارت کی اور وہاں کے پُر تکلف ماحول میں خود کو مستغرق پایا۔ ایسی روحانی کیفیت کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

بعض کالموں میں انھوں نے اپنی یاد کا حصہ بننے والے اسفار کو ہی سفر نامے کا رنگ دیا ہے۔ انھوں نے کئی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ انھی درسگاہوں کے تحت سٹڈی ٹور کیا۔ یہ اسفار ان کی یادداشت کا حصہ بن گئے۔ ایسی ہی ایک یادداشت ان کے کالم ”خواب خوش رنگ میں کھُلتا دریچہ“ میں ہے۔

جس میں انھوں نے لاہور کے سفر کے بارے میں اپنے تجربات کو احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ انھوں نے اساتذہ کی سرکردگی میں یہ سفر اختیار کیا۔ پنجاب کے خوبصورت کھیتوں میں سے گزرتی ہوئی ریل گاڑی سے دیکھے گئے نظاروں کو آنکھیں کب بھلا سکتی ہیں۔ ان کے ہمراہ کئی دوست بھی تھے۔ ریل گاڑی پوری برق رفتاری کے ساتھ جارہی تھی۔ طلبہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس سفر کے تجربات کو آج تک یاد رکھا اور ۹ جنوری ۲۰۱۸ء کو انھوں نے اس سفر کو اپنے کالم کا موضوع بنایا انھوں نے لاہور میں کیا دیکھا ان ہی کی زبانی سنتے ہیں:

> ”ہم نے کئی تاریخی عمارات، شاہی قلعہ اور شاہی مسجد دیکھی۔ پھر علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی۔ شام کو کچھ دوستوں نے ”دوستی“ فلم دیکھی۔ اس دورے سے ہم سب بہت لطف اندوز ہوئے۔“[۱۶]

اس سفر کے دوران انھوں نے لاہور میں جن چیزوں کو دیکھا ان کی جزئیات کو یوسفی کے ساتھ کالم میں جگہ دی۔ وہاں پر کئی عمارات انھوں نے دیکھیں پھر تاریخی شاہی قلعے کی بھی انھوں نے سیر کی۔ مغلوں کی تعمیر کردہ بادشاہی مسجد کا بھی انھوں نے دورہ کیا۔ عظیم شاعر اور مفکرِ پاکستان علامہ اقبال کے مزار پر بھی انھوں نے حاضری دی۔ ان کی علامہ اقبال سے عقیدت کا منھ بولتا ثبوت ہے کہ وہاں پر فاتحہ خوانی بھی کی۔ اس دورے سے وہ خوب لطف اندوز ہوئے اور ان کی یہ خوشی ان کے متذکرہ بالا کالم سے بھی ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی سیر سے بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی لطف اندوز ہوئے۔ انھوں نے دورے کو بڑے عمدہ سفر نامے کا روپ دیا۔

> ”پرانی جگہوں پر جانے کا بھی ایسا ہی رومانس ہے، کبھی کبھی ان خرابوں میں خزانے مل جاتے ہیں۔“[۱۷]

ساڑھے تین ہزار سا قبل مسیح کے آباد کردہ شہروں ہڑپہ اور موہنجو داڑو پر انھوں نے ماضی کی طرف مراجعت کی اور وہاں پر دیکھی گئی جزئیات کو انھوں نے اپنے قلم کی نوک پر لایا۔ پرانی تہذیب کے وہ بہت

شیدائی نظر آتے ہیں اور اس کو دیکھنے کے لیے انھوں نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ موہنجو داڑو کے ساتھ ساتھ انھوں نے سکھر کی سیر کی اور اس پر بھی کالم لکھا۔ اس کالم پر بھی سفر نامہ نما تحریر کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ اس سفر کے دوران انھوں نے اس شہر کی تاریخ کو بھی کھنگالا اور ساتھ ہی موجودہ دور کے اہم رہنما خورشید شاہ کے بارے میں لوگوں سے بات بھی کی۔ لوگوں نے بھی ان کی تعریف کی۔ وہاں لوگوں نے خورشید شاہ صاحب کے انداز تکلم کی بھی تعریف کی ہے۔ خورشید شاہ نے وہاں پر صحت اور تعلیم کے میدانوں میں خاص طور پر کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ اپنے سفر کے دوران خاص بات انھوں نے خوبصورت منظر نگاری کی ہے۔ سکھر اور دریائے سکھر کی عمدہ تصویر کشی انھوں نے کی۔ اپنے اس سفر نامے میں انھوں نے جزئیات کو بڑے احسن انداز میں سمیٹا ہے۔ ان کا قلم منظر نگاری میں خوب جوہر دکھاتا ہے اور معجزہ بیانی کرتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کا مشاہدہ بہت گہرا اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ایک بڑے قلم کار کی طرح انھوں نے متذکرہ سفر نامہ نما کالم لکھا:

> "میں ان مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہوں لوگ آجا رہے ہیں۔ میرے سامنے دریائے سندھ کے پانیوں کی لہریں ہیں۔ جس میں ڈوبتا ابھرتا آسمان کا عکس ہے۔ دھوپ میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔"(۱۸)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے متذکرہ بالا کالم سکھر کے سفر کے دوران لکھا۔ اس کالم کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو ایک مختصر سفر نامہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کالم میں انھوں نے منظر نگاری عمدہ انداز میں پیش کی ہے۔ منظر نگاری کی معمولی سی معمولی اشیاء کو بھی تصویر کا حصہ بنایا ہے جس سے ایک مکمل اور جامع تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ ان کی یہ تصویر کشی علامہ اقبال کی نظم ہمالہ کی مانند ہے۔ جس میں منظر کی تمام ضروری اکائیوں کو جگہ دی ہے۔ جس انداز میں انھوں نے تصویر کشی کی ہے یہ دراصل ان کا گہرا مشاہدہ ہے کہ وہ اپنی چشم بینا سے عمدہ منظر تیار کرتے ہیں۔

پھر ان کے سفر نامہ نما کالموں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی ایک جگہ یا علاقے کا دورہ کرتے ہیں تو وہاں کی تاریخ کو بھی کھنگالتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے سکھر کی تاریخ کو بھی بیان کیا ہے۔ پنجاب کے علاقے جلیانوالہ پر بھی انھوں نے ایک کالم رقم کیا ہے۔ انھوں نے جلیانوالہ کا دورہ کیا پھر وہاں کے تجربات اور مشاہدات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخ کے اوراق کو بھی پلٹا۔ انھوں نے بتایا ہے انگریزوں کے خلاف آخری مزاحمت پنجاب کے علاقے جلیانوالہ کے بہادر سپوتوں ہی نے کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کئی کالم مختصر سفر ناموں کی ذیل میں رکھے جاسکتے ہیں۔ جس میں مصنف نے سفر نامے کے لوازمات کو پورا کیا ہے۔

ii۔ روداد نویسی

کسی محفل اور تقریب کا آنکھوں دیکھا حال اور اس کا بیان تحریری شکل میں کرنا روداد نویسی کہلاتا ہے۔ روداد نویسی بھی دورِ حاضر کی ایک اہم نثری صنف ہے جس کو اردو کے بیشتر لکھاری استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں چاشنی اور نفاست بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بھی کئی کالم ایسے لکھے ہیں جن پر روداد نویسی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ روداد میں ہم کسی شادی کی تقریب میں گزرے لمحات اور وہاں کے تجربات کو قاری تک پہنچاتے ہیں۔ شادی کے ساتھ ساتھ کسی بھی دوسری تقریب کی کہانی بیان کرنا بھی روداد نویسی کے زمرے میں آتا ہے۔ ہم اپنی زندگی کے روزمرہ کے تجربات کو بھی روداد نویسی کے زمرے میں لاسکتے ہیں۔ دراصل روداد نویسی کے لیے گہرے مشاہدے اور وسیع مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ روداد کے لیے کلاسیکی مطالعہ وسیع ہونا چاہیے۔ جس سے ایک اچھی روداد لکھنے میں معاونت حاصل ہوگی۔ یہ بھی روداد نویسی کا خوبصورت انداز ہے جو کہ ان کے ہاں شادی کی تقریبات سے لے کر ادبی محافل تک تمام قسم کی تقریبات روداد نویسی کا موضوع بنتی ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی ایک ماہر قلم کار ہیں۔ ان کی روداد کا انداز دلچسپ اور معلوماتی ہوتا ہے۔ ان کے کئی کالموں پر روداد نویسی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے سکول کے دور کی اسمبلی کو بھی روداد نویسی کا موضوع بنایا ہے جس سے ان کی یادداشت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"ہر صبح کا آغاز اسمبلی سے ہوتا جہاں تلاوت اور درس ہوتا، قومی ترانا پڑھا جاتا اور ایکسر سائز ہوتی۔ آج کل کے بچوں کو ساری باتیں غیر ضروری محسوس ہوگی۔"(۱۹)

بچپن کی اسمبلی جو کہ ان کی یادداشت کا حصہ ہے اس کی خوبصورت روداد انھوں نے رقم کی ہے۔ انھوں نے اپنے سکول کے زمانے کی روداد کو یاد رکھا ہے۔ وہ راولپنڈی کے ایک سکول میں زیر تعلیم رہے۔ اس زمانے میں چیزیں بہت سادہ اور قواعد کے تابع ہوتی تھیں۔ اب زمانہ بھی بدل گیا ہے اور ساتھ ہی طریقہ کار میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ اسمبلی میں تلاوت ہوتی تھی، قومی ترانہ بھی پڑھا جاتا تھا۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بھرپور ورزش کا سیشن بھی ہوتا تھا جو آج کل بالکل مفقود ہے۔ آج کل جسمانی صحت پر دھیان کم دیا جاتا ہے۔ سارا دھیان +A گریڈ لینے پر ہوتا ہے۔ گویا اس زمانے میں نمبرز کی دوڑ نے صحت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ مندرجہ بالا کالم انھوں نے اپنے اسکول کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے لکھا۔ پھر انھوں نے اس زمانے کے خصائص کو بڑے احسن انداز میں اپنے کالم میں سمیٹا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ آج کے زمانے سے بالکل مختلف، اس زمانے میں امیر اور غریب کا تضاد کم تھا بلکہ امیروں اور غریبوں کے بچے ایک ہی طرح کے سرکاری سکولوں میں پڑھتے تھے۔ آج تو طبقاتی تقسیم عروج پر پہنچ چکی ہے۔ جس کی وجہ سے اسکولوں کی بھی کئی اقسام ہیں۔ آج بیکن ہاؤس، سی ٹی اسکول سسٹم اور آکسفورڈ سکول سسٹمز آچکے ہیں جہاں امیروں کے بچے پڑھتے ہیں جبکہ غریبوں کے بچے وہی سرکاری سکولوں کا رخ کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اس مختصر روداد نما کالم میں موجودہ دور کے طبقاتی نظام پر بھرپور انداز میں طنز کیا ہے۔ اس زمانے کی اسمبلی ہی سے اندازا لگایا جاسکتا ہے کہ بچوں کی ذہنی نشو و نما پر خاص توجہ دی جاتی تھی جبکہ موجودہ دور میں کاروباری امور زیادہ توجہ طلب ہو چکے ہیں۔ اس طرح آج طبقاتی تقسیم بھی پورے زوروں پر ہے۔ بلاشبہ متذکرہ کالم ایک عمدہ روداد کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ایک مشاعرے میں بھی شرکت کی۔ منو بھائی: تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے، کے عنوان سے کالم لکھا۔ انھوں نے اس مشاعرے کی یاد کو اپنے متذکرہ بالا کالم میں پیش کیا۔ یہی دراصل روداد نویسی کی عمدہ مثال نظر آتی ہے۔

"مشاعرہ اپنے عروج پر ہے۔ نظم ختم ہوتی ہے تو ہال کی روشنیاں جل اٹھتی ہیں۔ یہ
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں منو بھائی کے لیے تعزیتی ریفرنس کی تقریب ہے۔"(۲۰)

منو بھائی کی یاد میں ایک مشاعرہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں رکھا گیا۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے ملک بھر سے ادیب آئے۔ مشاعرہ بڑا ہی پُر رونق تھا۔ اس مشاعرے کی روداد ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے ایک کالم میں لکھی۔ یہ کالم ۳۰ جنوری ۲۰۱۸ء کو چھپا۔ اس کالم پر روداد کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مشاعرہ بہت پُر رونق تھا۔ اس مشاعرے کی جان ملک بھر کے شعراء کرام تھے۔ افتخار عارف نے عمدہ نظم پڑھی۔ اس نظم نے مشاعرے کو چار چاند لگا دیے۔ اس نظم نے ایک سماں باندھ کر رکھ دیا۔ مشاعرے میں کچھ نظمیں منو بھائی کی یاد میں بھی پڑھی۔ مجموعی طور پر منو بھائی جیسے بڑے ادیب کو یاد کرنے کے لیے احسن انداز میں یہ مشاعرہ انجام پذیر ہوا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی تقریبات کی روداد کو بخوبی بیان کرتے ہیں۔ وہ خود بھی شاعر ہیں، مصنف ہیں اور بڑے ادیب ہیں۔ ان کی روداد نویسی میں ادبی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ساتھ ہی ان کے ہاں میدان جنگ میں پیش آنے والے واقعات کو بھی بیان کرنے کا ہنر ہے وہ صرف ادبی تقاریب کے بیان پر گرفت نہیں رکھتے بلکہ میدانِ جنگ کی منظر نگاری کے بیان پر بھی عبور حاصل ہے۔ پھر وہ میدانِ کارِزار کی روداد کو بھی وہ اس انداز میں اپنے کالموں میں پیش کرتے ہیں کہ قاری داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی بطور کالم نگار ایک نمایاں نام بنا چکے ہیں۔ کالموں کے لیے مواد وہ مختلف ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔ کبھی کسی تاریخی واقعہ کے ذریعے کو حکمت کی بات کہتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ تاریخی مقام کی سیر کرتے ہیں اور اس کی تاریخ کا بیان کرتے ہیں۔ بعض کالم انھوں نے شخصیات پر بھی لکھے ہیں۔ ان کو ہم خاکہ نما کالم کہہ سکتے ہیں۔ ان کے ہاں ادبی تقاریب اور معرکہ کارِزار کی رودادوں کے علاوہ بچپن کے واقعات بھی ہیں۔ بچپن میں گزرے واقعات وہ روداد کے انداز میں ایسے بیان کرتے ہیں:

"ہماری عمروں میں اتنا ہی فرق تھا سارا دن کھیل کود کے بعد مجھے سرِ شام نیند آ جاتی مگر
انعام بھائی کی یہ خواہش ہوتی کہ ہم دیر تک باتیں کریں۔"(۲۱)

مندرجہ بالا اقتباس ان کے کالم " جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ کالم انھوں نے بھرپور جذبات میں لکھا۔ ان کے بھائی کی وفات کے بعد یہ کالم رقم کیا گیا۔ دراصل ان کے بھائی گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کو جب وہیل چیئر پر دیکھا تو شاہد صدایقی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

جب انھوں نے بھائی پر کالم رقم کیا تو ان کے ساتھ گزرے شب و روز کو بھی یاد کیا۔ انھوں نے اپنے بچپن کے واقعات کو اس کالم میں بیان کیا ہے۔ صبح سے شام تک کے امور کو متذکرہ بالا کالم میں بیان کیا ہے۔ اس طرح ان کے احاطے کی داد دینی پڑے گی کہ موصوف نے اپنے بچپن کی جزئیات کو بھی اپنے ذہن کے پنہاں خانوں میں محفوظ کر کے رکھا ہوا ہے۔

پہلے بھی متذکرہ ہوا کے موصوف کے کالموں میں تقاریب کی عکاسی بھی موجود جو کہ روداد نویسی کا حصہ ہے۔ انھوں نے بچپن کے واقعات کو فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی تقاریب کے مناظر اور واقعات کا بیان بھی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ ان کا بچپن راولپنڈی میں گزرا۔ اس لیے راولپنڈی شہر سے ان کی یادوں کا گہرا ربط ہے۔ وہ جن اداروں میں زیرِ تعلیم رہے ان سے متعلقہ واقعات کا بیان بھی کمال جذبات نگاری سے کرتے ہیں۔ سکول کے ابتدائی زمانوں کی تقاریب ہوں یا اسمبلی ہو اس کے بیان کے لیے روداد نویسی کا سہارا لیتے ہیں۔ بچپن زیادہ تر لوگوں کا خوش گوار ہوتا ہے۔ مصائب و آلائم سے انسان بیگانہ ہوتا ہے بچپن کی یہ رنگینیاں اور رعنائیاں ان کالموں میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتیں ہیں۔ پھر ان واقعات کے بیان کے لیے ادب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان کے بچپن کی بہت روداد یں ہیں۔ ان کے کالموں میں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تقریب میں وہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل ہوئے اس تقریب میں بیٹھے بیٹھے وہ ماضی کی یادوں میں گم ہو گئے۔

> "اس سلسلے میں مجھے بھی دعوت ملی۔ تقریب کا اہتمام ایک ہال میں کیا گیا تھا۔ یہ ہال اس وقت نہیں تھا جب میں یہاں پڑھا کرتا تھا۔ ہال میں کالج کے طلبہ اور اساتذہ موجود تھے۔۔۔۔۔۔ہال میں بیٹھے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ستر (۷۰) کی دہائی میں واپس لوٹ گیا ہے۔ "(۲۲)

مندرجہ بالا کالم دراصل سرسید کالج راولپنڈی میں ایک تقریب ہوئی جس میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں انھوں نے جن مناظر کو دیکھا ان کا بیان بھی کیا۔ انھوں نے اپنے ماضی کا دریچہ بھی کھولا کہ ایک وقت ہوا کرتا تھا جب وہ اس کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ وہاں کے شب و روز کو انھوں نے متذکرہ کالم میں بھی بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ایک کالم اپنے اسکول کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ایک چھوٹا سا اسکول چراغ بدر کے نام سے کھلا تھا۔ جب وہ اس اسکول میں گئے تو انھوں نے پھر بچپن کو

یاد کیا اور اپنے اسکول کے دور کی اسمبلی کا تذکرہ بھی کیا۔ وہ علامہ اقبال کی معروف نظم لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری، کی آواز سنتے ہیں۔ جہاں سے آواز آرہی ہوتی ہے وہ اس طرف چل دیتے ہیں۔ جب وہ اس دو کمروں پر مشتمل عمارت کے باہر پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک اسکول ہے۔ سامنے لکھا ہے "چراغ بدر" اور بر آمدے میں اسمبلی ہو رہی ہے۔ پھر وہ واپس اپنے بچپن کی اسمبلی کو یاد کرتے ہیں اور اس کا بیان اپنے کالم میں روداد کے انداز میں کرتے ہیں۔

تحقیقی نکتہ نظر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے کالموں میں روداد نویسی کا عنصر نمایاں ہے۔ مختلف نوعیت کی رودادیں ان کے کالموں میں موجود ہیں۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں پیش آنے والے واقعات کو بھی روداد کے انداز میں بیان کیا۔ اس سے متعلقہ مناظر کے بیان میں بھی انھوں نے روداد نویسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ تقریب کے مناظر کے ساتھ ساتھ تقریب کے واقعات کو بھی قلم کی نوک پر لے کر آتے ہیں پھر بچپن میں گزرے خوبصورت واقعات کا بیان بھی روداد کے پیرائے میں کیا ہے۔

iii۔ شخصیت نگاری

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ہمیں شخصیت نگاری کے عناصر بھی بدرجہ اتم ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی کالموں میں شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ یعنی کئی کالم ایسے ہیں جو کہ اپنے جاننے والے افراد کے بارے میں ہیں۔ ان کالموں میں انھوں نے موضوعِ بحث شخصیت کے بارے میں پورے انہماک سے اپنی بات کو بیان کر دیا ہے۔ اُس شخصیت کے کردار کو بڑی جامعیت کے ساتھ اپنے کالموں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے موضوع بحث افراد میں پائی جانے والی خوبیوں کا احاطہ بھرپور مشاہدے کے ذریعے کیا ہے۔ اُن کی اس مہارت کی داد نہ دینا قلمی بد دیانتی ہو گی۔ انھوں نے زیادہ تر کالم اساتذہ کے متعلق لکھے ہیں وہ چونکہ خود بھی معلم ہیں پھر وہ تعلیم ہی سے متعلقہ انتظامی عہدوں پر فائز بھی رہے ہیں۔ زندگی کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ادباء کا نمبر ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی خود بھی ایک اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں اس لیے ان کے حلقہ احباب میں بہت سے ادباء شامل ہیں۔ جب کسی دوست کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہو تو کالم کے ذریعے اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کچھ کالم رشتہ داروں اور دور پار کے جاننے والوں کے متعلق بھی مل جاتے ہیں۔ شخصیت

نگاری در اصل ایک عمل ہی ایسا ہے جو بہت دلچسپ اور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے شخصیت نگاری کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> "شخصیت کے بارے میں جاننے کی خواہش ہر انسان میں قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے۔ دنیا بھر شخصیات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مسلسل لکھا جارہا ہے کیونکہ شخصیت کا مطالعہ ناول اور افسانے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔"(۲۳)

واقعی جاوید اختر بھٹی کا یہ دعویٰ درست ہے کہ شخصیت نگاری ایک دلچسپ موضوع ہے۔ کسی بھی شخصیت کے بارے میں جاننے کا عمل بڑا دلچسپ ہے اور انسان، انسان کے بارے میں جاننا پسند کرتا ہے۔ ناول میں تو فرضی کردار پیش کیے جاتے ہیں اور کہانی بھی فرضی ہوتی ہے یہی حال افسانے کا بھی ہے کہ کہانی میں حقیقت کی رمق موجود نہیں ہوتی۔ جب کہ شخصیت کے بارے میں جاننا مبنی بر حقیقت بھی ہے اور دلچسپ بھی ہے۔

جیسا کہ قبل ازیں تذکرہ ہوا کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں اساتذہ کی شخصیت کی گرہیں کھولی ہیں۔ انھوں نے اساتذہ کے متعلق جو لکھا ہے وہ آج کے دور میں مشعلِ راہ بنایا جاسکتا ہے۔ اپنے اُردو کے استاد کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ: "اردو زبان و ادب پر ان کی دسترس تھی طلبہ میں شعر و ادب کے ذوق کی آبیاری میں ان کا بنیادی کردار تھا۔"(۲۴)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے اردو کے استاد کے متعلق اس کالم میں لکھا ہے۔ انھوں نے اس دور کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس دور کے اساتذہ بہت محنتی تھے۔ اس کالم میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ صرف نصابی کتاب تک محدود نہ رہتے تھے بلکہ بقیہ معلومات بھی اپنے طالب علموں تک پہنچاتے۔ وہ ان کے علم کی پیاس بجھاتے اور کوشش کرتے کے بھرپور تیاری کرکے کلاس میں جائیں۔ وہ نصابی کتاب کے علاوہ اردو ادب کے مشہور شعراء کے بارے میں بھی گفتگو کرتے اور ان کے اشعار بھی سناتے تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت کے ایک رخ کو ڈاکٹر شاہد صدیقی کے اس کالم میں بیان کیا ہے۔

ملتان سے تعلق رکھنے والا مشہور و معروف جنگجو سلطان مظفر خان تھا۔ جب سکھوں نے پنجاب کی طرف قدم بڑھائے تو اس نے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ان کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑا کہ اس کا نام تاریخ میں امر

ہو گیا۔ اس کی اس بہادری کی صفت کو بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے ایک کالم میں بیان کیا ہے۔ اس کی شخصیت پر انھوں نے کالم لکھا ہے۔ اس کی شخصیت کی گرہیں اس انداز سے کھولی ہیں:

"مظفر خان ایک بہادر جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر سفارت کار بھی تھا۔"(۲۵)

سلطان مظفر خان نے بڑی محنت کے ساتھ ملتان اور اس کے اطراف میں اپنی سلطنت کو مضبوط کیا تھا۔ اس نے نہ صرف سلطنت بنائی بلکہ اطراف کی سلطنتوں سے بھرپور تعلقات بھی قائم کیے۔ لیکن سکھوں کے عزائم کے آگے نہ ٹھہر سکے لیکن تاریخ میں ان کا نام امر ہو گیا۔ وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے والے حیاتِ جاوید پالیتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں ایک دنیا کو آباد کیا ہے۔ ان کے متعلق افتخار عارف کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

"زیر آسمان میں ایک نگار خانہ رقصاں کا اہتمام ہے، جس میں یہ تصویر ہزار شیوہ صد ہزار معانی کے ساتھ دلکش و دلآویز۔۔۔۔۔ دل میں گھر کر جانے والا۔"(۲۶)

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ملتان کے مظفر خان کی شخصیت کی گرہیں عمدگی کے ساتھ کھولی ہیں۔ آگے چل کر وہ معروف ادیب دیوان سنگھ مفتون کے بارے میں بھی ایک کالم لکھتے ہیں۔ اس کالم میں انھوں نے مفتون کی شخصیت کو جاننے کی سعی کی ہے۔ وہ ایک متنازعہ شخصیت بن کر ابھرے لیکن انھوں نے یادِ مخالف کے آگے ہمیشہ سینہ سپر ہو کر کام کیا، اگرچہ انھوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ذاتی محنت اور لگن سے انھوں نے صحافت اور ادب میں ایک نام پیدا کیا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

"مفتون کے صحافتی اور ادبی کارناموں کو دیکھیں تو یقین نہیں آتا لیکن سکول کی تعلیم کی کمی کو دیوان سنگھ نے اپنی محنت، لگن اور ذاتی تربیت سے پورا کیا۔"(۲۷)

دیوان سنگھ مفتون ایک باجرات صحافی تھا۔ انھوں نے راجاؤں اور مہاراجوں سے ہمیشہ ٹکر لی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ ان کے راز فاش کریں۔ اس لیے وہ بہت سے مقدمات میں الجھے رہے اور کئی دفعہ جیل بھی جانا پڑا۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی بھی کمی نہیں آتی۔ ایک کالم میں انھوں نے

حسن مہیب مراد کی کے بارے میں بھی رقم کیا ہے۔ حسن مہیب مراد کی کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک فرماں بردار بیٹے کے روپ میں رہے انھوں نے اپنی والدہ کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ پھر حسن مہیب کی شخصیت کا ہر رخ زیادہ گہرائی کے ساتھ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے بحیثیت باپ اپنے بچوں پر ہمیشہ شفقت کا ہاتھ رکھا اور انھوں نے بطور خاوند بھی بھرپور کردار نبھایا۔ وہ بہت سحر خیز اور تہجد گزار تھے۔ اس طرح ان کی شخصیت کے ہر رخ کو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے لیے بعض شخصیات تحریک کا باعث بنیں ہیں، ان کے لیے انھوں نے لکھا ہے:

> "شکیل عادل زاد، مسٹر بکس والے یوسف بھائی، مظہر کلیم، منو بھائی، کنور مہندر سنگھ بیدی اورر امنہ سید صاحبہ یہ وہ صاحبان فن جو زندگی میں تحریک کا باعث بنتے رہے ہیں۔ انھی میں ایک کتاب دیوان سنگھ مفتون کی سوانح عمری "ناقابلِ فراموش" بھی ہے۔"(۲۸)

در اصل انسانی زندگی میں بعض شخصیات تحریک کا کام کرتی ہیں۔ سمجھ دار اور علم و فضل والے دوستوں کی صحبت نعمت عظمیٰ سے کم نہیں ہے۔ ہم علم کا ایک بڑا حصہ شخصیات کے ذریعے بھی حاصل کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام شخصیات علم و ادب کے اہم ستارے ہیں۔ جن سے مل کر زندگی نگوں ہو جاتی ہے۔ ان شخصیات کا اثر لیے بغیر انسان نہیں رہ سکتا، یہی بات متذکرہ بالا اقتباس میں بھی موجود ہے۔ انھوں نے جہاں بہت بڑے بڑے مصنفین کی شخصیات کے بارے میں رقم کیا وہیں انھوں نے گاؤں کے ایک کردار "سکینہ" پر بھی کالم لکھا۔ سکینہ ایک جاندار اور متحرک کردار کے روپ میں ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے گاؤں کی سی سادگی اس شخصیت میں جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کے کردار چھمی اور سکینہ میں کافی مشابہت نظر آتی ہے۔ اس کی بے باکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> "کبھی کبھی میں نے اسے حقہ بھی پیتے دیکھا اور کبھی سگریٹ کے کش لگاتے بھی، یہ سکینہ تھی جسے ارد گرد کے لوگوں کی پرواہ نہیں تھی۔"(۲۹)

یہ سکینہ در اصل بڑا جرات مند کر دار ہے۔ اس کی شخصیت میں باغیانہ رویہ نمایاں ہے۔ یہ دراصل پورا مرد نظر آتا ہے۔ اس نے کبھی بھی لوگوں کی پرواہ نہیں کی۔ وہ فلسفیانہ خیال رکھتی تھی کہتی تھی لوگوں کا کیا ان میں سے اکثر نے منافقت کی چادر اوڑھی ہے، اس لیے وہ ان کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔

جیسا کہ پہلے بھی ایک اقتباس میں تذکرہ ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے اساتذہ سے اپنے کالموں میں والہانہ لگاؤ کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی دہائی کے محنت کش اور عمدہ شخصیت کے مالک اساتذہ کی شخصیت کی عکاسی بھی ان کے کالموں کا خاصا ہے۔ سجاد شیخ جو ان کے استاد ہیں ان کے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

> "شیخ صاحب نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولے کہ میں ہر روز رات ۱۱ بجے تک اگلے روز کے لیکچر کی تیاری کرتا ہوں۔"(۳۰)

اس اقتباس سے ان کے استاد کی شخصیت کا ایک اہم رخ کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ علم دینے کی بھرپور سعی کرتے تھے۔ وہ بھرپور تیاری کے ساتھ کلاس میں آتے تھے۔ نصابی کتاب اور اس سے متعلقہ کتب کو بڑی باریک بینی کے ساتھ پڑھتے تھے پھر اس سے ممکنہ سوالات نکالتے اور جب کلاس میں جاتے تو ان کی شخصیت سے ہی ان کی تیاری کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ ہر سوال کا برجستہ جواب دیتے تھے۔ اس طرح سجاد شیخ ایک محنتی اور دیانت معلم کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے کالموں میں جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے اس کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ تحقیق کے بعد یہ سامنے آتی ہے کہ انھوں نے جس بھی شخصیت سے کچھ تعلق رکھا پھر اس بارے میں جب لکھا تو اس میں کمال غیر جانبداری اور بھرپور مشاہدہ نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں عالم، ادیب، سیاستدان، ہیروز اور ادباء کی شخصیت کی عکاسی واضح طور پر نظر آتی ہے۔

iv۔ مضمون نگاری

مضمون در اصل ایسی تحریر ہے جس میں کسی موضوع پر لکھاری اپنے احساسات، جذبات اور معلومات کو درج کرتا ہے۔ مضمون میں معلومات کو اخذ کرنے کے لیے مختلف ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو میں مضمون نویسی کی ابتداء سر سید احمد نے کی ہے۔ ان کے رفقانے بھی بھرپور مضمون لکھے۔ سر سید کا رسالہ "تہذیب الا خلاق" دراصل اردو نثر کے فروغ کے لیے شائع ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر مضمون ہی

چھپتے تھے۔اس لیے سر سید احمد خان اردو میں مضمون نگاری کے بابا آدم تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کثرت سے مضامین لکھے گئے۔ معاشرے کے مختلف پہلوؤں پر ادباء نے اپنے انداز سے خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کی اور ڈاکٹر شاہد صدیقی کے مضمون بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کے کئی کالموں میں مضمون نگاری کے رنگ موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں ان کے کالموں کی اپنی حیثیت کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں مضمون کا رنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے کئی کالموں پر مضمون کی صنف کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ ایک کالم "سکول اور سزا: اروح کے زخم کون دیکھے" در اصل طنزیہ مضمون ہے جن میں انھوں نے معلومات اور کوائف کو ایک جگہ پر یکجا کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "یونیسف کی ایک تحقیق کے مطابق پاکستان کے ایک صوبے میں سکولوں میں تینتالیس اقسام کی سزائیں رائج ہیں۔"(۳۱)

ہمارے پاکستانی معاشرے میں یہ قباحت موجود ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ان پر سختی برتی جاتی ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سزا کے بغیر تعلیم کا تصور شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بچوں کو طرح طرح کی ماریں دی جاتی ہیں جس سے ان کو جسمانی اور نفسیاتی ایذائیں دی جاتی ہیں جن سے ان کی شخصیت پر منفی اثر پڑتا ہے اور وہ پوری عمر ان اثرات سے آزادی نہیں حاصل کر سکتے ہیں جبکہ بیرونی دنیا میں سزا کا تصور موجود نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ متذکرہ بالا کالم میں ڈاکٹر شاہد صدیقی نے مضمون کے انداز میں ہمیں معلومات فراہم کیں ہیں۔ اسی بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں بچوں کی ایک کثیر تعداد سکول کی دہلیز تک نہیں پہنچ پاتی۔ جو بچے اگر سکول چلے بھی جاتے ہیں تو ایک اور تحقیق کے مطابق تینتیس فیصد بچے پرائمری سے قبل ہی سکول چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس سزا کے تصور نے تعلیمی نظام پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

مضمون کی ایک قسم تاریخی مضمون بھی ہوتا ہے۔ اس میں مضمون میں تاریخ کے کسی اہم دور کو ادبی زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ یا کسی معروف تاریخی شخصیت یا بادشاہ کے کالموں کا تذکرہ بھی ادبی نوعیت کے مضمون کا موضوع بن سکتا ہے۔ ہمارے تاریخی ہیرو سر سید احمد خان ہیں۔ تاریخ کے اس دور کے بارے میں بھی ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ایک کالم "علی گڑھ": منزلِ یقین کا پہلا سنگِ میل لکھا۔ جس میں انھوں نے سر سید کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے سر سید کے خوبیوں کے بارے میں بھی لکھا:

"سر سید اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان کو درپیش چیلنج بہت بڑا ہے اور اس کے لیے انھیں جامع جواب کی ضرورت ہے۔"(۳۲)

در اصل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بر صغیر کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ انھیں سابق حکمران سمجھ کر ہر طرح سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی گئی۔ در اصل یہ انگریزوں کی سازش تھی۔ ایسے میں مسلمانوں کو ایک دانشمند قیادت کی ضرورت تھی جو سر سید کے روپ میں ملی۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے مسلمانوں کی علمی فلاح کے لیے کام کیا۔ اس لیے بر صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کے اہم رہنما بن کر ابھرے۔ ان پر شاہد صدیقی نے کالم رقم کیا اور اس مضمون نما کالم میں تاریخی رنگ جھلکتا ہے۔

ایک مضمون تعارفی نوعیت کا بھی ہوتا ہے جس میں کسی شخص، علاقے اور جگہ کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک مضمون نما کالم بریڈلال ہال: آخر شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے، میں لکھا ہے۔ اس نام کی ایک عمارت تھی جس کا تعارف انھوں نے متذکرہ بالا کالم میں کروایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ ۱۹۰۰ء کا سال، اکتوبر کی ۳۱ تاریخ اور لاہور کا ایک روشن دن، آج بریڈلال ہال کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے کانگریس کے سینئر رہنما نریندر بنیرجی کو دعوت دی گئی ہے۔"(۳۳)

در اصل "بریڈلال ہال" نام کی ایک عمارت لاہور میں واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی عمارت ہے جو ۱۹۰۰ء میں قائم ہوئی۔ اس عمارت کی تعمیر کا مقصد ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مزاحمتی سیاست کو فروغ دینا تھا۔ یہاں پر وقت کے بڑے بڑے سیاست دان اکٹھے ہوئے تھے۔ یہاں پر ملک کے تمام سیاستدان غور و فکر کے بعد اپنا لائحہ عمل طے کرتے تھے۔ یہ در اصل ایک پلیٹ فارم تھا جہاں پر انگریزوں کے خلاف

ہندوستانی متحد ہوئے تھے۔ اس عمارت کو بنے ہوئے بھی ۱۲۰ سال ہو گئے۔ اس تاریخی عمارت کے متعلق شاہد صدیقی صاحب نے معلومات کو اکٹھا کیا اور اس کو اپنے کالم میں جامعیت کے ساتھ بیان کیا۔ یہ کالم در اصل تعارفی مضمون نظر آتا ہے۔ تاریخی نوعیت کا ایک اور مضمون "دارالعلوم دیوبند" کے متعلق لکھا۔ بلا شبہ دارالعلوم دیوبند کی بھی تعلیمی میدان میں خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ یہ مسلمانوں کا ایک اہم ادارہ تھا جس نے اسلامی تعلیمات کے پھیلاؤ میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اس تعلیمی ادارے پر شاہد صدیقی صاحب نے ایک کالم رقم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس طرح جنگ آزادی کے نو سال بعد ۱۸۶۶ء کو چھتہ مسجد میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔"(۳۴)

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں بھی انھوں نے کالم رقم کیا ہے۔ دارالعلوم ایک اہم مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی ادارہ تھا۔ اس کے قیام سے بر صغیر کے مسلمانوں کو ایک اہم مذہبی درسگاہ میسر آتی ہے یہاں سے پڑھ کر نکلنے والے لوگوں نے تحریک آزادی میں اپنا حصہ ڈالا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے مطابق اس کے قیام کا دراصل مقصد یہ تھا کہ یہاں مسلمانوں کی آزادی کے لیے تعلیم یافتہ طبقہ بیدار کیا جائے۔ یہ در اصل علی گڑھ کے ادارے کے طرز کے خلاف ادارہ تھا اس میں دینوی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی جبکہ علی گڑھ جدید تعلیم کی شمع روشن کیے ہوئے تھا لیکن مقصد دونوں کا ایک تھا مسلمانوں کی تعلیمی میدان میں خدمت کرنا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے تاریخی نوعیت کے مضامین دونوں اداروں پر قلم بند کیے۔

اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں مضمون نگاری کے رنگ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جہاں یہ رنگ اپنے پورے جوبن پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے معاشرتی نوعیت کے مضامین میں معاشرے میں پائی جانے والی روایات پر لکھا ہے۔ تعلیمی نوعیت کے مضامین میں میدان تعلیم میں ہونے والی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ تعارفی مضامین میں تاریخی جگہوں کا بیان سامنے آتا ہے۔ اس طرح ان کے کالموں میں مضمون نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔

v۔ خاکہ نگاری کے رنگ

خاکہ اردو ادب کی ایک اہم نثری صنف ہے۔ اس صنف میں شخصیت کے ظاہر و باطن کی عکاسی کی جاتی ہے۔ خاکے کو انگریزی میں Scatch کہا جاتا ہے۔ فن مصوری میں اس سے ملتی جلتی ایک اصلاح ہے جس کو Portrate بھی کہتے ہیں۔ اس میں مذکورہ شخص کی ہو بہو تصویر بنائی جاتی ہے۔ دراصل خاکہ کسی شخص کے معروضی مطالعے کا نام ہے۔ اس کو ہم قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس میں شخصیت کے ظاہری خدوخال کے ساتھ ساتھ اس کے کردار کی خصوصیات کا احاطہ بھی کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری بڑی دلچسپ صنف ہے، جب قاری اس کو پڑھتا ہے تو وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ خاکہ کا موضوع کسی بھی طرح کی شخصیت ہو سکتی ہے۔ اس میں معمولی سے معمولی شخصیت سے لے کر بڑی سے بڑی شخصیت کی تصویر بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ خاکہ نگاری کو دیگر اصناف میں ایک منفرد مقام حاصل ہے:

> "خاکہ نگاری دیگر اصناف سے زیادہ پُرکشش اور دلچسپ صنف ہے۔ میرے نزدیک اچھا خاکہ کسی شخصیت کا بھرپور تعارف ہوتا ہے۔ میری ترجیح انسان کے اندر کو تلاش کرنا رہی ہے۔"(۳۵)

خاکہ نگاری بڑی دلچسپ صنف ہے۔ خاص طور پر اس میں جب مزاح کی چاشنی شامل ہو تو یہ مزید دلچسپ بن جاتی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں کو ناول پڑھنے پر ترجیح دی جاتی ہے۔ زیر لب تبسم ہر وقت قاری کے لبوں پر رہتا ہے۔ دراصل شخصیت کا مطالعہ انتہائی دلچسپ کام ہے۔ ہر کوئی شخصیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف پُر تجسس ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بھی کئی خاکے لکھے ہیں۔ ان کے کئی کالم ایسے ہیں جن پر خاکے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ آئندہ صفحات میں ان کی کالم نگاری میں خاکہ نگاری کے رنگ تلاش کرنے کی سعی کی جائے گی۔

انھوں نے سب سے زیادہ خاکے اپنے اساتذہ کے لکھے ہیں۔ اساتذہ انھیں بڑے محبوب تھے۔ چاہے چھوٹی کلاسز کے اساتذہ ہوں یا ایم۔ اے کے انھوں نے سب کو یکساں طور پر یاد رکھا ہے اور لائق شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے استاد منیر صاحب کا نقشہ اس انداز میں پیش کیا ہے:

"وہ ہمیں 9thA میں ریاضی پڑھاتے تھے۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، سفید کپڑوں پر سیاہ شیروانی زیب تن کرتے۔"(۳۶)

اپنے استاد محترم سرور منیر کا خوب صورت نقشہ متذکرہ بالا اقتباس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ سرور منیر صاحب جو ایک کلاس میں ان کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ اس خاکے میں ان کے ظاہری خدوخال کو پوری جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی بڑی آنکھیں ہیں۔ ان کے سادہ لباس کی تعریف بھی کی ہے۔ ریاضی جیسے دقیق اور مشکل مضمون کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اور خوب محنت کے ساتھ آسان کرکے بیان کرتے تھے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے قلم سے اپنے اساتذہ کے بہت سے خاکے لکھے ہیں جو کالموں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ انھوں نے بچپن کے اساتذہ کو بھی یاد رکھا۔ انھوں نے اساتذہ کا بھرپور حق ادا کیا اور عمدہ تصاویر پیش کیں ہیں۔ حتی کہ جن جن اداروں میں وہ پڑھے وہاں کی یادوں کو انھوں نے کالموں میں سمیٹا اور وہاں پر جن اساتذہ سے پڑھا ان کی خوبیوں کو خاکے کی صورت میں بیان کیا۔

ان کے بھائی "انعام" نام تھا۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی ان سے گہری محبت کرتے تھے۔ وہ بیمار ہوئے اور گردوں کے عارضے میں مبتلا ہونے کے بعد انتقال کرگئے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی نے لکھا:

"وہ دوستوں کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار رہتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شام کے معمولات وہی تھے۔ دوستوں کے ساتھ وہی محفلیں۔"(۳۷)

اپنے بھائی کے بارے میں متذکرہ کالم لکھا۔ جس پر خاکے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے انعام بھائی کی شخصیت کے رُخ کھولے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انعام بھائی بہت دوست رکھتے

تھے۔ دوستوں کے ساتھ ان کی محافل خوب جمتی تھیں۔ جب وہ بیمار ہوئے تو شاہد صدیقی صاحب سے مل کر خوب روئے اس جگہ جذبات نگاری عمدہ کہی جاسکتی ہے۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے والد صاحب کے بارے میں بھی ایک خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے اپنے والد کی عادات و اطوار کو عمدہ انداز میں لکھا ہے۔ خاکے کا عنوان ہے۔ ''آج تم یاد بے حساب آئے'' والد صاحب بہت نظم و ضبط کے حامل انسان تھے۔ وہ اپنے کام مقررہ وقت پر کرتے تھے، بڑے سحر خیز تھے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی نے لکھا ہے:

''کبھی کبھار رات کو رونے کی آواز سے آنکھ کھل جاتی تو میں ڈر جاتا دیکھا تو رات کی تاریکی میں والد صاحب جائے نماز پر بیٹھے ہیں اور روتے ہوئے ان کی گھگھی بندھ گئی۔''(۳۸)

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے والد بڑے عابد اور زاہد انسان تھے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے بلکہ تہجد گزار بھی تھے۔ اپنے رب کے حضور ان کا رونا اور گریہ زاری متذکرہ بالا کالم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح انھوں نے خاکے کے انداز میں اپنے والد کے اوصاف کا بیاں واشگاف الفاظ میں کیا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے ایک خاکہ نما کالم سجاد شیخ کے بارے میں بھی لکھا۔ جو ان کے استاد تھے۔ ہر فن میں یکتا اور کمال مہارت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو کتابوں سے لگاؤ بھی تھا جس کا تذکرہ انھوں نے سجاد شیخ: خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا، کے عنوان سے کالم لکھ کر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''شیخ صاحب کو کتابوں سے عشق تھا وہ انگریزی، اردو اور پنجابی ادب کے رسیا تھے۔''(۳۹)

سجاد شیخ کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کتاب دوستی بھی ان کی شخصیت کا اہم حصہ تھی۔ وہ علم جو انھوں نے مطالعہ کیا اس کو استعمال میں بھی لایا ایک وقت آیا کہ وہ ایک اہم نقاد اور مترجم کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے۔ متذکرہ بالا کالم میں انھوں نے اپنے استاد سجاد شیخ کی شخصیت کی کئی جہات پر قلم اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اساتذہ ہی نہیں بلکہ اپنے رفقا کو بھی یاد رکھا، انھوں نے جہاں ملازمت کی وہاں پر ان گنت سے دوست بھی بنائے۔ انھوں نے پھر ان دوستوں کو اپنی تحریروں میں بھی جگہ دی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران ان کے ایک رفیق جاوید صاحب بھی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے ایک کالم میں ان کو یاد کرتے ہوئے لکھا:

''وہ یونیورسٹی کے اساتذہ، مالیوں اور نائب قاصدوں سے گھل مل کر رہتے تھے۔''(۴۰)

ڈاکٹر شاہد صدیقی صاحب نے جاوید صاحب کو ایک درویشی صفت انسان بتایا تھا جس کے اندر تکبر، غرور نام کی بال بھر بھی جگہ نہ تھی۔ وہ ہر ایک کو اپنے برابر خیال کرتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ملازمین کے ساتھ گھل مل کر رہے۔ محبتیں بانٹتے اور تقسیم کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو عزت دیتے تھے۔ اس طرح شاہد صدیقی صاحب نے اپنے کالموں میں کئی خاکے لکھے ہیں۔ جس میں ان کے کئی دوست، احباب، استاد اور رفقاء شامل ہیں۔

تحقیق کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی عصرِ حاضر کے ایک ایسے کالم نگار ہیں جن کے اسلوب بیاں میں ادب کی چاشنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اردو ادب کی کئی اصناف کے رنگ ان کے کالموں میں موجود ہیں۔ آپ عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہوئے قاری تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کالم تحریر کرتے ہوئے خوبصورت اور عمدہ تشبیہات اور محاورات کا بھی بر محل استعمال کر کے اپنے کالموں میں جان ڈالتے ہیں۔ آپ کے کالموں میں ادبیت کی مکمل چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا تعلق ادب سے بہت گہرا ہے۔ آپ کے کالموں میں جابجا ادب کی کئی اصناف موجود ہیں جن میں سے ایک رنگ سفر نامے کا کئی ایسے کالم آپ نے تحریر کیے جن پر سفر نامے کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کئی جگہوں مثلاً ہڑپہ، ساہیوال، سکھر، ترکی اور کشمیر وغیرہ کے سفر کیے اور پھر ان تمام اسفار کو اپنے کالموں میں جگہ دی۔ یوں سفر نامے کے تمام لوازمات کو اُن کے کالموں میں پرکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی اصناف میں سے ایک صنف روداد نویسی کی ہے جو کہ ہمیں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے تعلیمی، ادبی اور دوسری محافل میں شرکت کر کے اُن کو روداد کے انداز میں قارئین کے گوش گزار کیا ہے۔

جہاں تک شخصیت نگاری جیسی ادبی صنف کا تعلق ہے تو وہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں بدرجَہ اُتم موجود ہیں۔ آپ کے بہت سے کالم شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ آپ نے ان کالموں میں اُن شخصیات کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ بڑی ہی جامعیت کے ساتھ انھوں نے متذکرہ شخصیت کو اپنے کالم میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کالموں میں تمام تر شخصیات کے بارے میں اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ متذکرہ شخصیت کا پورے کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے لہٰذا وہ خاکہ نگاری جیسی ادبی صنف سے بھی بخوبی واقف ہیں جس کا رنگ اُن

کے کالموں میں جگہ جگہ دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ اپنے قلم پر مکمل گرفت رکھتے ہیں۔ ادب سے گہرے لگاؤ کا ثبوت آپ کے کالموں کا مطالعہ کرنے سے لگایا جا سکتا ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے پرکھنے کے بعد اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں خاکہ نگاری کا عنصر بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں مضمون نگاری کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ کئی قسم کے معلوماتی مضامین ہمیں اُن کے کالموں میں ملتے ہیں لہٰذا ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے اسلوب کو تحقیقی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کے بعد وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں نثری اصناف کے کئی رنگ موجود ہیں۔ یوں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم رنگ برنگے پھولوں کے دستے کہے جا سکتے ہیں اور مجوزہ تحقیق میں شامل تمام تر کالم اُن کی ادبی دنیا سے دلچسپی کا منھ بولتا ثبوت ہیں جو کہ اپنے اندر ادبی اصناف کے مختلف رنگوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

د: ڈاکٹر شاہد صدیقی کے موضوعات کا ہم عصر کالم نگاروں کے موضوعات سے تقابل

ڈاکٹر شاہد صدیقی عصر حاضر کے اہم کالم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے کالم کے موضوعات روشِ عام سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ روشِ عام سے ہٹ کر ہونے سے مراد ہی یہی ہے کہ آپ کے ساتھ جو آپ کے ہم عصر کالم نگار کالم تحریر کرتے ہیں ان کے ہاں جو موضوعات پائے جاتے ہیں وہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں خال خال ہی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں کالم نگاری کے موضوعات کو دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ کے ہاں شخصی، تعلیمی، تاریخی اور ادبی موضوعات کی بھرمار ہے۔ آپ نے معاشرے میں موجود ایک خاص موضوع کو بارہا اپنے کالموں کے ذریعے سے قارئین کے گوش گزار کیا ہے وہ اہم موضوع ہے تعلیم، استاد اور معاشرے میں تبدیلی۔ اگر ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ۲۰۱۷ء سے ۲۰۱۹ء تک کے تمام کالموں میں سے تعلیم سے متعلق موضوعات کو نکالیں تو یہ فہرست کچھ یوں بنتی ہے:

استاد، تعلیم اور تبدیلی، سرکاری سکول کیا تھے اور کیا ہو گئے، تعلیمی حکمت عملی: معیار کا مسئلہ، یکساں نصاب: خواب سے تعبیر تک، تعلیمی عدم مساوات، تعلیم اور آزادئ اظہار، تعلیم قومی ترجیحات کی نئی صف بندی، تعلیمی نارسائی، تعلیمی اہداف: خواب ہی خواب کب تک دیکھیں، تعلیم اور پائیدار ترقی کا تصورم تعلیم، کلچر انڈسٹری اور شخصی آزادی، تعلیمی نظریات: تفہیم نو کی ضرورت، تعلیمی اداروں میں ادبیت کی اہمیت وغیرہ جیسے تعلیمی موضوعات بارہا ملتے ہیں۔ ماہر تعلیم ہونے کے ناطے اور تعلیمی اداروں سے وابستگی کی بدولت آپ نے تعلیمی اداروں میں جن خامیوں کو دیکھا ان پر قلم اٹھایا اور ان خامیوں کو دُور کرنے کے لیے تجاویز بھی پیش کیں ہیں۔

تعلیمی موضوعات کے علاوہ آپ کے ہاں تاریخی نوعیت کے موضوعات ملتے ہیں مثلاً پنجاب کی پہلی مزاحمت، موہنجو داڑو: فاصلوں کی کمند سے آزاد، شہیدوں کا چمنستان، جلیانوالہ: پنجابی مزاحمت کا آخری مورچہ، دارالعلوم دیوبند اور تاج برطانیہ کے خلاف مزاحمت، ہڑپہ: یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں، رائے احمد خان کھرل: پنجابی مزاحمت کا استعارہ، بریڈ لال ہال: آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے وغیرہ۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے موضوعات میں تعلیمی مسائل اور تاریخیت کا پہلو سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ علم، شاعری، ادب، تحقیق اور تجسس کے ملاپ سے لکھے جانے والے اِن کے کالم ادب اور تاریخ کے لیے سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں تحریروں میں جو رنگ ملتا ہے وہ ہمیں ماضی کی یادوں میں لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی محض معلومات فراہم کرنے کے لیے نہیں لکھتے بلکہ آپ اپنے تجربے میں شریک کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں اور یہ بات بھی باور کرواتے ہیں کہ منظر کو صرف دیکھنا نہیں چاہیے بلکہ محسوس کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں ادبیت کے رنگوں میں رنگی تحریریں ہیں جنھیں وہ شاعری کے ملے جلے رنگوں کے ساتھ قارئین کے سپرد کرتے ہیں جبکہ آپ کے ہم عصر کالم نگاروں مثلاً رؤف کلاسرا، ایاز میر، ظفر اقبال، بیرسٹر حمید باشانی، ایم ابراہیم خان، علامہ ابتسام الٰہی ظہیر، مفتی منیب الرحمن، عمار چوہدری وغیرہ کے نام کالموں کے موضوعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ہم عصر کالم نگاروں کے ہاں جو

موضوعات پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر سیاسی، مذہبی، اقتصاری، معاشی اور روز مرہ ملک میں ہونے والے حالات و واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ظفر اقبال جو کہ آپ کے ہم عصر کالم نگار ہیں اگر ان کے کالم کو ہی لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ روز مرہ کے اخبار کی سرخیوں کو لیتے ہیں اور ان پر اپنی رائے قلمبند کرتے ہیں۔ ظفر اقبال جو کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہم عصر کالم نگار ہیں آپ پاکستان کے معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین کالم نگار بھی ہیں۔ ظفر اقبال "دال دلیا" کے عنوان سے کالم تحریر کرتے ہیں آپ کے کالموں کے موضوعات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ آپ کے کالموں کے چند موضوعات کو اگر لیا جائے تو خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کا کس قسم کے موضوعات کو قلمبند کرتے ہیں مثلاً سرخیاں ان کی اور متن ہمارے، "سرخیاں"، متن، زیر آسمان اور ندیم ملک، سرخیاں، متن اور مسعود احمد کی شاعری، سرخیاں، متن اور افتخار عارف کی غزل وغیرہ وغیرہ۔ ظفر اقبال کے کالموں کے موضوعات روز مرہ ملک میں ہونے والے حالات و واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جس میں وہ سرخیاں لیتے ہیں اور ان سرخیوں پر اپنے انوکھے انداز میں لکھتے ہیں کبھی مزاحیہ اور کبھی سنجیدہ انداز میں اور ہر کالم کے آخر میں شاعری کا استعمال کرتے ہیں کبھی ذاتی شاعری اور کبھی دیگر شعراء کی شاعری اور یہ شاعری بھی خبروں سے متعلق ہی ہوتی ہے ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہاں جو چند مخصوص موضوعات لگاتار دکھائی دیتے ہیں وہ موضوعات ہمیں ظفر اقبال کے ہاں خال خال ہی ملتے ہیں کیونکہ ظفر اقبال چند مخصوص موضوعات پر نہیں لکھتے بلکہ وہ روز مرہ معاشرے میں رونما ہونے والے حالات کو اپنے کالموں میں جگہ دیتے ہیں۔

رؤف کلاسرا ایک ایسے کالم نگار ہیں جو کہ آپ کے ہم عصر کالم نگاروں میں شمار ہوتے ہیں ان کے ہاں ہمیں مختلف نوعیت کے کالم آئے روز دیکھنے کو ملتے ہیں وہ ایک جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی نہیں کرتے جیسا کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ہمیں ایک جیسے موضوعات ہی بار بار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ رؤف کلاسرا اور دیگر ہم عصر کالم نگاروں کے ہاں پائی جانے والی زبان بھی صحافتی زبان ہوتی ہے جبکہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کی زیادہ تر زبان ادبی نوعیت کی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کے موضوعات سیاسی دکھائی نہیں دیتے بلکہ بیشتر موضوعات تعلیمی، تاریخی، علمی وادبی اور شخصیت نوعیت کے ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاں اس قسم موضوعات سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں جبکہ دیگر روز مرہ کے معاشرتی حالات واواقعات پر مبنی موضوعات کی بارہا کمی محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے ہم عصر ہر نوعیت کے موضوعات کو اپنے کالم کا حصہ بناتے ہیں جبکہ ان کے ہاں کچھ مخصوص قسم کے موضوعات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ تعلیمی موضوعات، تاریخی موضوعات اور ذاتی نوعیت کے موضوعات وغیرہ۔ جہاں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں کچھ موضوعات کی بھرمار ہے۔ وہیں آپ کے ہاں کچھ موضوعات کی کمی بھی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ڈاکٹر شاہد صدیقی کی اردو کالم نگاری اپنے اندر ادبیت کی چھاپ رکھتی ہے۔ آپ نے جس انداز سے اردو کالم نگاری کو نئی شکل، نیا انداز اور نیا لہجہ دیا ہے وہ پاکستان میں آج تک کسی دوسرے کالم نگار کی قسمت میں نہیں آیا۔ لہذا آپ کے کالم کی یہی خاصیت جو کہ آپ کو دیگر معاصر کالم نگاروں سے جدا مقام دلاتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عابد علی عابد، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص ۴۴

۲۔ محمد حسن عسکری، تخلیقی عمل اور اسلوب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۸

۳۔ اسلم ڈوگر، فیچر یا کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۴۰

۴۔ خلیل بیگ، ڈاکٹر، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، اداری زبان و اسلوب، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴۷

۵۔ رابعہ سرفراز، اسلوب کیا ہے (مضمون) مشمولہ: تخلیقی ادب، شمارہ ۵، ۲۰۰۸ء، نمل اسلام آباد، ص ۱۴۲

۶۔ رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۱

۷۔ محمد اسلم، ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۴۳

۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکول اور سزا، روح کے زخم کون دیکھے گا (کالم)، مطبوعہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، پنجابی زبان اور معاشرتی رویے (کالم) مطبوعہ، روزنامہ دنیا، اسلام آباد، دنیا، اسلام آباد، ۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، کنور مہندر سنگھ بیدی، زندگی کے میلے اور محبت کا جادو (کالم) مطبوعہ، روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۸

۱۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ (کالم)، مطبوعہ، روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۳

۱۲۔ شاہد صدیقی ، ڈاکٹر، سر سید کالج، گہرے رنگوں اور مسحور کن خوشبو کا زمانہ (کالم) مطبوعہ ، روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۵ جون ۲۰۱۸، ص ۱۲

۱۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکینہ (کالم)، مطبوعہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۱۴۔ صبیحہ انور، سفر نامہ ایک جائزہ (مضمون) www.ncpulblog.com، ۳۰ جنوری ۲۰۲۰ء، PM۳:۲۰

۱۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، قونیہ، رومی اور شمس کا شہر، (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، ۱۷ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۴

۱۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خواب خوش رنگ میں کُھلتا دریچہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۳

۱۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ہڑپہ: یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۱۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، دریائے سندھ کا ہمراز (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۷ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۴

۱۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خوابِ خوش رنگ میں کھلتا دریچہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۳

۲۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، منو بھائی، تمھارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، مطبوعہ ۳۰ جنووری ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۲۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۳

۲۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سر سید کالج: گہرے رنگوں اور مسحور کن خوشبو کا زمانہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۵ جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۲۳۔ جاوید اختر بھٹی، بیس نامور ادبی شخصیات، بیکن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵

۲۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خواب خوش رنگ میں کُھلتا دریچہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۳

۲۵۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، مارچ کا مہکتا مہینہ اور ملتان کا مظفر خان (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳ مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۲۶۔ افتخار عارف، فلیپ، مشمولہ: زیرِ آسماں از شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء

۲۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، حیرت کدہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۹ جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۲۸۔ قاسم یعقوب، زیر آسمان: کتاب زندگی، شاہد صدیقی کی نئی کتاب (مضمون) www.daanish.pk، ۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء، ۱۰:۷PM

۲۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سکینہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۶ نومبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۳۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سجاد شیخ، خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۱ دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۳۱۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، اسکول اور سزا: روح کے زخم کون دیکھے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۳۲۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، علی گڑھ: منزلِ یقین کا پہلا سنگِ میل (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۷ نومبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۳۳۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، بریڈ لال ہال، آخر شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۹ دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۳۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، دارالعلوم دیوبند اور تاجِ برطانیہ کے خلاف مزاحمت (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۳ فروری ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۳۵۔ شاہد حنائی، چہرہ نما، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵

۳۶۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، خواب خوش رنگ میں کھلتا دریچہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۳

۳۷۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، جلتی دھوپ چھاؤں جیسا تھا وہ (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲ مئی ۲۰۱۸ء، ص ۳

۳۸۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آج تم یاد بے حساب آئے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۷ اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۳۹۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سجاد شیخ: خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۱۱ دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۴۰۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، ایک دور عجیب تھا کہ تم بھی میرے ساتھ تھے (کالم) مطبوعہ: روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۹ جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۰

باب چہارم:

مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

الف: مجموعی جائزہ:

مجوزہ تحقیقی موضوع میں سب سے پہلے کالم نگاری کے بنیادی مباحث کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ کالم نگاری کی تعریف، اہمیت اور لغات کی روشنی میں اس کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کالم دراصل ایک صحافتی تحریر ہے لیکن اپنے اسلوب، زبان اور بیان کے اعتبار سے بعض کالم ادب کی دنیا میں بھی شمار کئے جاسکتے ہیں۔ کالم ایک ایسی تحریر ہے جو کسی اخبار میں مخصوص عنوان کے تحت باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ کالم دراصل اخبار کی زینت ہے جس میں حقائق کو طشت ازبام کیا جاتا ہے اور مبنی برحقیقت واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ کالم دراصل عوام کی رہنمائی اور آگاہی کا بھرپور فریضہ ادا کرتے ہیں۔ بعض کالم نگار تو اتنے معروف ہوئے کہ قاری ان کالموں کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔ اس طرح اردو میں بھی کالم نگاری کا آغاز جام جہاں نما سے ہوا ہے اور اب یہ صنف ایک الگ اور نمایاں مقام حاصل کر چکی ہے۔

اردو کی کالم نگاری کی ابتدائی اشکال انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس دوران کالم میں زبان اور اسلوب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ پھر کوہ نور اخبار میں بھی ایسی تحریریں چھپتی تھیں جس کو ہم کالم کہہ سکتے ہیں۔ اردو کا مشہور اخبار، دہلی اردو اخبار، مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے جاری کیا کالم نگاری کے حوالے سے روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اخبار نے حرارت مندانہ صحافتی رویے کی بنیاد رکھی۔ جس کی پاداش میں مولوی محمد باقر کو گولی مار دی گئی۔ اس کے بعد سر سید احمد خان اردو صحافت کے علمبردار بنے انھوں نے "سید الاخبار" میں کام کیا۔ اس تجربے ہی کی بدولت وہ بعد میں "سائنٹیفک گزٹ"، اور "تہذیب الاخلاق" جاری کرنے کے قابل ہوئے۔

سر سید کے ساتھ ہی اردو میں کالم نگاری کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ "الہلال" میں مولانا ابو الکلام آزاد کے کالم اور زمیندار میں مولانا ظفر علی خان کی کالم نگاری بھی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے رسالے نگار کے ذریعے اس پودے کو تناور درخت بنانے کے لیے تمام کاوشیں کی اور پھر اردو کالم نگاری کا پودا ہمیں تن تناور درخت کے روپ میں نظر آتا ہے۔

پہلے باب میں یہ بھی مطالعہ کیا گیا کہ قیام پاکستان کے بعد کالم نگاروں کی ایک نمایاں کھیپ ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس میں نوائے وقت جو کہ قیام پاکستان سے قبل شائع ہونا شروع ہوا کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ پھر ان کالم نگاروں نے کالم لکھا اور عوام کی راہنمائی کی۔

تحقیق عمل کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ کالم کو تین بڑی اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے۔ موضوعاتی اسلوبی اور مشاہداتی، پھر ان کی ذیلی اقسام بے شمار ہیں۔ موضوعاتی کالموں میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی وغیرہ جبکہ اسلوبیاتی کالموں میں فکاہیہ، سنجیدہ، علاتی، مکتوباتی اور اقتسابی کالم وغیرہ اسلوبیاتی قسم میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پھر مشاہداتی کالموں میں مباحثی اور ڈائری نما کالم آتے ہیں۔ مجوزہ تحقیق کے پہلے باب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی ۱۸۵۸ء میں راولپنڈی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم راولپنڈی سے حاصل کی جبکہ ایم۔ اے انگریزی کی ڈگری معروف درسگاہ گورڈن کالج سے حاصل کی، بعد میں پی۔ ایچ۔ ڈی انھوں نے کینیڈا کی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بطور لیکچرار عملی زندگی کا آغاز کیا اور کئی اداروں کے سربراہ بھی رہے۔ پاکستان کی معروف یونیورسٹی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے اور اس یونیورسٹی کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ آج کل نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں فیکلٹی آف سوشل سائنسز کے ڈین کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کا تعلیمی پس منظر اگرچہ انگریزی کا ہے لیکن وہ اردو سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور اپنی زبان پر انھیں ناز ہے۔ ابتدا میں انھوں نے انگریزی میں کالم لکھے اور ملک کے نمایاں اخباروں میں ان کے کالم باقاعدہ سے چھپتے رہے۔ اردو کالم نگاری کا آغاز بہت بعد میں ہوا، ستمبر ۲۰۱۷ء میں انھوں نے روزنامہ دنیا میں زیر آسماں کے عنوان سے کالم لکھنے شروع کیے اور آج تک لکھ رہے ہیں۔ یہ سطور لکھنے تک ان کے زیر تحقیق کالموں کی کتاب بھی منظر عام آچکی ہے۔

مجوزہ تحقیق کے دوسرے باب میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب اور فنی لوازم پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ اسلوب دراصل مصنف کا اظہار ہے جس طریقے سے وہ اپنے جذبات اور معلومات کا اظہار کرتا ہے۔ دراصل وہی اسلوب کہلاتا ہے۔ پھر ادبی زبان اور صحافتی زبان کے فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ادبی زبان میں دراصل زبان کو اولیت دی جاتی ہے جبکہ صحافتی زبان میں زبان ثانوی حیثیت رکھتی ہے جبکہ واقع اور وقوعہ اہم ہے۔ اس طرح ادیب کے پیشِ نظر بھی زبان کو اولیت حاصل ہے جبکہ صحافی واقعہ کو اولیت دیتا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا اسلوب ہی ان کو ادب کے دائرے میں لے کر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے کالموں میں عام فہم اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں مہارت دکھائی دیتی ہے۔ ادبی اور شائستہ الفاظ کا انتخاب واضح نظر آتا ہے۔ ان کے کالموں کا اسلوب ان کے کالموں کو ادبی فن پارے کا درجہ دیتا ہے۔ ادب کے بہت سے فنی لوازم کو ان کے کالموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

باب کے دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے کس طرح ادبی اصطلاحات کی مدد سے اپنے کالموں کو دلچسپ بنایا ہے۔ انھوں نے گہرے مطالعے اور مشاہدے کے بل بوتے پر روزمرہ کے تجربات کو فن کی شکل عطا کی ہے۔

ان کے کالموں میں بیانیہ انداز کی وضاحت کی گئی ہے۔ بیانیہ انداز کے اندر کس طرح کڑی سے کڑی ملا کر کہانی کا انداز اپنایا گیا ہے۔ ان کے کالموں میں کہانی پن نمایاں ہے، جب کسی سفر پر روانہ ہوتے ہیں یا کسی

بات کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کے لیے بیانیہ انداز اپناتے ہیں۔ بات کو کہانی کے روپ میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس سے قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ واقعات کے خوبصورت تسلسل سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ جس طرح زنجیر کی کڑیاں آپس میں ملی ہوتیں ہیں اس طرح شاہد صدیقی کے کالموں میں چھوٹے چھوٹے واقعات ایک دوسرے سے جڑ کر بیانیے کا تاثر دیتے ہیں۔

چونکہ کالم اخبار میں چھپتا ہے اور اس کے لیے مخصوص اور مختصر سی جگہ ہوتی ہے۔ کالم نگار کو اپنی بات کم سے کم الفاظ میں بیان کرنی ہوتی ہے۔ صحافتی تحریروں میں ہی عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اختصار کو اپنے کالموں میں پوری کوشش کے ساتھ برتا ہے۔ اس اختصار میں انھوں نے بات بھی پوری بیان کی ہے اور اختصار کا خیال بھی رکھا ہے۔ اس سے فائدہ ہوا ہے کہ قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرلیتا ہے۔ اس طرح اختصار ان کے کالموں کا ایک اہم وصف ہے۔

فصاحت اور بلاغت کا ایک اور عنصر ان کے کالموں میں پایا جاتا ہے۔ جب وہ کسی منظر، واقع یا حالات کا بیان کرتے ہیں تو اس واقع کے بیان کے لیے ایسے ہی الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں۔ صبح کے منظر کے بیان کے لیے شیریں اور شائستہ الفاظ کا چناؤ دکھائی دیتا ہے۔ گویا منظر کے بیان کے لیے ویسی ہی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں کسی بھی نامانوس لفظ کا استعمال نہیں کرتے اور نہ ہی زبان میں کسی جگہ رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ اس طرح بلاغت ان کے کالموں کا ایک نمایاں وصف ہے۔ بلاغت کی وجہ سے کالموں کو پڑھنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے چونکہ اخبار کا قاری ہر ذہنی سطح کا ہوتا ہے اس لیے ان کے کالموں میں یہ عنصر پایا جاتا ہے کہ زبان نامانوس نہ ہو اور عام فہم ہو۔

منظر نگاری ان کے کئی کالموں میں نمایاں ہے۔ جب کسی تصویر کو دیکھتے ہیں اور منظر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس منظر کی لفظی تصویر اس انداز سے ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ اس کی تمام شکل قاری کے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔ ان کی منظر نگاری ناول نگار کی منظر نگاری سے ملتی جلتی ہے۔ اطراف کے تمام مناظر کو وہ تمام تر اکائیوں کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تصویریں جامع بن جاتی ہیں۔

تجسس اور دلچسپی کے عناصر کسی بھی ادب پارے کا لازمی جزو ہوتے ہیں کیونکہ قاری پڑھتے ہوئے اکتاہٹ اور بے چینی کا شکار نہ ہو بلکہ تحریریں اس پر گراں نہ گزریں۔ وہ ذوق اور شوق سے متعلقہ لٹریچر کو پڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دلچسپی کے عناصر کو اپنے کالموں میں برتا ہے اور قاری ذوق و شوق سے ان کالموں کو پڑھتا ہے۔

شاعر افسانہ نگار، ناول نگار اور سفر نامہ نگار قدرتی مناظر سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ منظر نگاری بھی ادب کا لازمہ ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی بھی مناظر فطرت سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ ناول نگار اور سفر نامہ کی مانند وہ قدرتی مناظر کی تصویر کشی اپنے کالموں میں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جزئیات نگاری بھی ان کے کالموں کا ایک اور اہم فنی عنصر ہے۔ جب وہ کسی منظر کو قاری کے سامنے لانا چاہتے ہیں تو اس کی تمام چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ ان اکائیوں کے بعد ان کی جزئیات نگاری کی مہارت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کی جزئیات منظر کی بھرپور تصویر پیش کرتی ہیں۔ وہ منظر نگاری ہی میں نہیں بلکہ واقعات کے بیان میں بھی جزئیات نگاری کا خیال رکھتے ہیں۔ کسی واقعہ کی تمام چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو مرتب کر کے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے گہرے مشاہدے کا شائبہ کہا جا سکتا ہے۔

جذبات نگاری کا بیان بھی ان کے کالموں کا اہم فنی عنصر ہے۔ وہ کسی بھی جذبے کو اس کے تمام لوازمات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ خوشی کا جذبہ ہو یا غم کا جذبہ وہ ایسے بیان کرتے ہیں کہ قاری کو اس کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے کالموں میں کرداروں کی تصاویر بھی ہمارے سامنے پیش کیں ہیں۔ انھوں نے کرداروں کے خدوخال اور ان کے اوڑھنے پہننے کے بارے میں عمدگی سے لکھا ہے۔ اس طرح کرداروں کی عمدہ تصاویر ہمیں ان کے کالموں میں نظر آتیں ہیں۔

تلازمہ خیال در اصل بہت سے مصنفین نے ناولوں، افسانوں اور سفر ناموں میں اپنایا ہے۔ یہ دراصل کسی بات کو بیان کرنے کا انداز ہے۔ کسی شخص، چیز، جگہ اور واقعہ سے تمام یادوں کو احاطہ تحریر میں لایا

جاتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں تلازمہ خیال ایک اہم اور نمائندہ صفت ہے۔ تلازمہ خیال کا استعمال ان کے کالموں میں کثرت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سیر و سیاحت کے شوقین ہیں۔ مختلف جگہوں، عمارتوں اور اشخاص سے متعلقہ یادوں کو وہ اپنے کالموں میں سمیٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کو ادبی شوق ورثے میں ملا ہے۔ ان کو شعر و شاعری سے گہرا شغف ہے۔ کلاسیکی شاعری کا انھوں نے گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر افتخار عارف تک ان کو کئی شعرا کے اشعار یاد ہیں۔ وہ کسی واقعہ کی زیادہ بہتر وضاحت کے لیے اپنے کالموں میں اشعار کا استعمال کرتے ہیں پھر کئی جگہ وہ نثر ہی میں شاعرانہ الفاظ کا جابجا استعمال کرتے ہیں۔ خوبصورت شعری تراکیب کو وہ اپنے کالموں میں بے ساختہ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی نثر میں شاعری پوری طرح رچی ہوئی نظر آتی ہے۔

مجوزہ تحقیق کے تیسرے باب میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ادبی اصناف کے رنگوں کا بیان کیا گیا ہے۔ ان رنگوں کو ہم ان کے کالموں میں دیکھ سکتے ہیں۔ مختلف ادبی اصناف کے جس معیار کو اعلیٰ پائے کے لکھاریوں نے قائم کیا ہے اس معیار کو ڈاکٹر شاہد صدیقی نے قائم رکھنے کی سعی کی ہے۔ ان کے کالموں میں بہت سی نثری اصناف کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ادبی اصناف کا رنگ نمایاں ہے۔ سفر نامہ اس حوالے سے ایک اہم صنف ہے جس کے حوالے سے اردو میں کافی لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک کے سفر اختیار کیے۔ ان کو انھوں نے مختصر سفر ناموں کی شکل دے کر اپنے کالموں میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے دریائے سکھر، جہلم، ہڑپہ کے سفر کیے ان کو اندرون ملک کے سفر نامے کہا جاسکتا ہے۔ پھر وہ استنبول اور قونیہ گئے۔ وہاں کے مشاہدات کو بھی اپنے کالموں میں یوں بیان کیا جس سے سفر نامے کا عنصر صاف نظر آتا ہے۔

روداد نویسی بھی نثری اصناف میں شامل ہے۔ ادبی محفل، تقاریب اور تعلیمی کانفرنسوں کی رودادیں ان کے کالموں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ مختلف اداروں میں بطور سربراہ کام کرتے رہے۔ ان کے کئی کالم

شعراء کی یاد میں لکھے گئے ہیں ان کالموں میں شعراء کے ساتھ جن مشاعروں میں شریک ہوئے، بیان نظر آتا ہے۔ روداد نویسی ہی کی ذیل میں ادبی تقاریب اور تنقیدی نشستوں اور تعلیمی کانفرنسوں پر بھی کالم لکھے گئے ہیں۔

انھوں نے افراد پر بھی کئی کالم لکھے اور ان کی شخصیت کی اہم گرہیں کھولیں ان کالموں میں اُن کا موضوع بحث شخصیت کا کردار اور شخصیت نگاری پر رہی ۔یعنی ان کے کالموں میں سوانحی عنصر بھی نظر آتا ہے۔ کئی کالم افراد کی سوانح کے بارے میں ہیں جن میں ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔

مضمون جو ایک نثری صنف ہے جس میں مصنف کسی موضوع پر اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو بیان کرتا ہے یہ بھی ان کے کالموں میں نظر آتا ہے۔ مضمون نما کالم بہت جامع اور مختصر ہیں۔ ان کالموں میں معلومات کا ایک خزانہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی متعلقہ موضوع پر معلوماتی انداز اپناتے ہیں۔ وہ گہرے مشاہدے اور کوشش سے مواد حاصل کرتے ہیں اور اس کا بیان ان کے کالموں میں ملتا ہے۔

خاکہ نگاری جو کہ غیر افسانوی نثری صنف ہے۔ یہ اردو ادب کی ایک جاندار اور نمایاں صنف ہے۔ لکھاری افراد سے متعلقہ اپنے احساسات، جذبات اور تجربات کا بیان کرتا ہے۔ اس میں فرد کی ذاتی زندگی، ظاہری اور باطنی اوصاف کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ سب سے زیادہ خاکے ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اپنے اساتذہ پر لکھے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کئی ادباء پر بھی لکھا ہے۔ جس میں خاکہ نگاری کے تمام لوازم موجود ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں میں ادب کی اصطلاحات اور ادبی اصناف کے رنگ رچے بسے نظر آتے ہیں۔

ب: نتائج:

۱۔ مذکورہ تحقیق میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کا فنی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالم ادبی فن پارے ہیں۔ انھوں نے ادب کی کئی اصناف کو اپنے کالموں میں برتا ہے۔ ان اصناف کا رنگ ان کے کالموں میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔

۲۔ ان کے کالموں کا انداز بیانیہ ہے۔ کہانی کی طرح وہ اپنی بات کو خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔

۳۔ مجوزہ تحقیق میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کے کالموں میں اختصار نمایاں ہے۔ وہ جامع الفاظ کے ساتھ واقعات کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

۴۔ ان کے کالموں کے مطالعے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فطرت کے خوبصورت مناظر سے ان کی گہری دلگی ہے اور یہ لگاؤ ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔

۵۔ انھوں نے اپنے کالموں میں دلچسپی کے عناصر کو بھی سمویا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری ان کے کالموں کا مطالعہ کرتے ہوئے اکتاتا نہیں ہے بلکہ ایک فرحت بخش کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

۶۔ انھوں نے اپنے کالموں میں مناظر کی چھوٹی چھوٹی اکائیوں کو صفحے پر لایا ہے۔ جس سے جزئیات نگاری کا گہرا احساس ہوتا ہے۔

۷۔ جہاں پر کسی بھی واقعے میں جذبات کو بیان کیا ہے اس کا حق بھی پورا ادا کیا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی میں پیش آمدہ جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

۸۔ تلازمہ خیال کے بل بوتے پر انھوں نے کئی جگہوں کی تاریخ اور ان کے معاشرتی خدوخال کو عیاں کرتے ہوئے ان جگہوں سے متعلقہ شخصیات کا تعارف بھی کروایا ہے۔

۹۔ ان کے کالموں کے غائر مطالعے کے بعد یہ بھی عیاں ہوا ہے کہ ان کے کئی کالموں پر چھوٹے چھوٹے سفر ناموں کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ کالموں کے مطالعے سے واضح ہوا ہے کہ انھوں نے ادبی تقاریب اور محافل کو بھی بھرپور انداز میں روداد کا رنگ دیا ہے۔

۱۱۔ انھوں نے کئی شخصیات پر کالم لکھے ہیں۔ پھر ان شخصیات کے کرداروں کو جامعیت کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کے کئی کالموں پر خاکہ نگاری کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

ج: سفارشات:

۱۔ زیر نظر تحقیق میں ڈاکٹر شاہد صدیقی کے کالموں کی فنی جہات کا مطالعہ کیا گیا جبکہ ان کے کالموں کا فکری مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ معاصر عہد کے کئی مسائل ان کے کالموں میں جھلکتے ہیں۔ اس لیے ان کے کالموں میں عصری حیثیت کے حوالے سے بھی کام کی گنجائش موجود ہے۔

۳۔ ان کے معاصر کالم نگاروں کے ساتھ تقابلی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

روزنامہ دنیا، منتخب شمارے (۱۲ستمبر۲۰۱۷ء تا مارچ۲۰۱۹ء)

ثانوی ماخذ:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، بار اول ۲۰۱۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء

افتخار عارف، فلیپ، مشمولہ: زیرِ آسماں از شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء

آصف فرخی، تعارف، مشمولہ: آدھے ادھورے خواب، مصنف :شاہد صدیقی، ڈاکٹر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

جاوید اختر بھٹی، بیس نامور ادبی شخصیات، بیکن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۸ء

خلیل بیگ، ڈاکٹر، زبان، اسلوب اور اسلوبیات، اداری زبان و اسلوب، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

رشید امجد، ڈاکٹر، رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء

سہیل انجم، احوال صحافت، ذاکر نگر، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

سید اقبال قادری، رہبر اخبار نویسی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

شاہد حنائی، چہرہ نما، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۱ء

شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے ون پبلشرز، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء

ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، کالم کلامیاں، ادارہ علم و فن، پاکستان، ستمبر ۱۹۹۵ء

عابد علی عابد، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء

عابد علی عابد، اسلوب، علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۹۷۴ء

عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاکستان وہند میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء

عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، کاروان پریس، لاہور، ۲۰۰۸ء

محمد اسلم، ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

محمد حسن عسکری، تخلیقی عمل اور اسلوب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء

محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)، پبلی کیشنز مزید چیمبر عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی، پاکستان، ۱۹۸۰ء

مسکین علی حجازی، پنجاب میں اردو صحافت، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء

مسکین علی حجازی، ڈاکٹر، پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

مولانا احمد صابری، روح صحافت، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۸ء

نور اسلام ندوی، رہنمائے صحافت، نوشاد عالم (پرنٹ میڈیا) پٹنہ، ۲۰۱۲ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، مکتبہ عالیہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۳ء

لغات:

وارث سرہندی، ایم اے، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

Qomi English Urdu Dictionary, Edited by Dr. Jameel Jalbi, 2013

Little oxford English Dictionary, Edited by Sara Hawker, oxford University press, New York, 2006, A.D

رسائل و جرائد:

رابعہ سرفراز، اسلوب کیا ہے (مضمون) مشمولہ: تخلیقی ادب، شمارہ ۵، ۲۰۰۸ء، نمل اسلام آباد

انٹرنیٹ:

صبیحہ انور، سفر نامہ ایک جائزہ (مضمون) www.ncpulblog.com، ۳۰ جنوری ۲۰۲۰ء، ۳:۲۰PM

قاسم یعقوب، زیر آسمان: کتاب زندگی، شاہد صدیقی کی نئی کتاب (مضمون) www.daanish.pk،

۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء، ۷:۱۰PM

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	موضوع	صفحہ نمبر	اخبار کا نام	تاریخ اشاعت
۱۔	زیر آسماں	آج بے طرح تیری یاد آئی	۶	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۲ ستمبر ۲۰۱۷ء
۲۔	زیر آسماں	گورڈن کالج: آئینہ آواز میں چمکا کوئی منظر	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۹ ستمبر ۲۰۱۷ء
۳۔	زیر آسماں	یعقوب کا یوسف: بھٹکا ہے دل ہوا کی طرح منزلوں سے دُور	۵	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۶ ستمبر ۲۰۱۷ء
۴۔	زیر آسماں	شکیل عادل زادہ: اے عشقِ جنوں پیشہ	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۳ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۵۔	زیر آسماں	استنبول: یہ رشتہ و پیوند	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۶۔	زیر آسماں	قونیہ: رومی اور شمس کا شہر محبت	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۷ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۷۔	زیر آسماں	سکول اور سزا: روح کے زخم کون دیکھے گا؟	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۴ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۸۔	زیر آسماں	گاؤں، بچپن اور بارش: ایسے ہیں جیسے خواب کی باتیں	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۳۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء
۹۔	زیر آسماں	علی گڑھ: منزل یقیں کا پہلا سنگِ میل	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۷ نومبر ۲۰۱۷ء
۱۰۔	زیر آسماں	انتہا پسندی اور تعلیم کا معاشرتی کردار	۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء
۱۱۔	زیر آسماں	پنجابی زبان اور معاشرتی رویے	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء
۱۲۔	زیر آسماں	پُر تاثیر قیادت اور سُخن دلنواز کی ساحری	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۸ نومبر ۲۰۱۷ء
۱۳۔	زیر آسماں	کاکوری کے سر فروشی: اے ایام کی مٹتی یاد گواہی دے	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۵ دسمبر ۲۰۱۷ء
۱۴۔	زیر آسماں	بھگت سنگھ: بنگا چک نمبر ۱۵ ضلع لائلپور	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء
۱۵۔	زیر آسماں	بریڈ لال ہال: آخر شب کے ہمسفر فیض نہ جانے کیا ہوئے	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۹ دسمبر ۲۰۱۷ء
۱۶۔	زیر آسماں	پوسٹ ماڈرن ازم کا چیلنج اور میڈیا	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۶ دسمبر ۲۰۱۷ء
۱۷۔	زیر آسماں	معاشرہ، طاقت اور شخصی آزادی	۳	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲ جنوری ۲۰۱۸ء
۱۸۔	زیر آسماں	خواب خوش رنگ میں کھلتا دریچہ	۳	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۹ جنوری ۲۰۱۸ء

۱۹۔	زیر آسماں	رائے احمد خان کھرل:پنجابی مزاحمت کا استعارہ	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۶جنوری ۲۰۱۸ء
۲۰۔	زیر آسماں	تعلیمی اداروں میں ادبیات کی اہمیت	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۳ جنوری۲۰۱۸ء
۲۱۔	زیر آسماں	منوبھائی: تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے	۱۰	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۳۰ جنوری ۲۰۱۸ء
۲۲۔	زیر آسماں	ہڑپہ : یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملے	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۶فروری ۲۰۱۸ء
۲۳۔	زیر آسماں	دارالعلوم دیو بند اور تاجِ برطانیہ کے خلاف مزاحمت	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۳ فروری ۲۰۱۸ء
۲۴۔	زیر آسماں	تعلیمی نظریات : تفہیم نو کی ضرورت	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۰ فروری۲۰۱۸ء
۲۵۔	زیر آسماں	سکھر:دریائے سندھ کا ہمزاد	۴	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۷فروری ۲۰۱۸ء
۲۶۔	زیر آسماں	تعلیم، کلچر انڈسٹری اور شخصی آزادی	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۶مارچ۲۰۱۸ء
۲۷۔	زیر آسماں	مارچ کا مہکتا مہینہ اور ملتان کا مظفر خان	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۳مارچ۲۰۱۸ء
۲۸۔	زیر آسماں	تعلیم اور پائیدار ترقی کا تصور	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۰ مارچ۲۰۱۸ء
۲۹۔	زیر آسماں	خوداحتسابی	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۷مارچ۲۰۱۸ء
۳۰۔	زیر آسماں	بھٹو صاحب: یہی بہار کے دن تھے کہ سُرخ رو ہوئے	۳	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۳ اپریل ۲۰۱۸ء
۳۱۔	زیر آسماں	بارش، کافی اور کتاب	۱۰	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۰ اپریل ۲۰۱۸ء
۳۲۔	زیر آسماں	آئی ایس پی آر کا ہلال:ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۴اپریل۲۰۱۸ء
۳۳۔	زیر آسماں	تعلیمی اہداف:خواب ہی خواب کب تلک دیکھیں	۳	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱ مئی ۲۰۱۸ء
۳۴۔	زیر آسماں	کنور مہندر سنگھ بیدی،:زندگی کے میلے اور محبت کا جادُو	۸	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۸ مئی۲۰۱۸ء
۳۵۔	زیر آسماں	تعلیمی نارسائی	۳	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۵ مئی ۲۰۱۸ء
۳۶۔	زیر آسماں	جلتی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ	۳	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۲مئی ۲۰۱۸ء
۳۷۔	زیر آسماں	مظہر کلیم:پھر کب ملیں گے؟	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۲۹مئی۲۰۱۸ء
۳۸۔	زیر آسماں	سر سید کالج:گہرے رنگوں اور مسحور کن خوشبو کا زمانہ	۱۲	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۵جون ۲۰۱۸ء
۳۹۔	زیر آسماں	حیرت کدہ	۱۰	روزنامہ"دنیا"اسلام آباد	۱۹جون ۲۰۱۸ء

۴۰۔	زیر آسماں	راولپنڈی کی لال کُرتی	۳	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۶جون ۲۰۱۸ء
۴۱۔	زیر آسماں	جلیانوالہ: پنجابی مزاحمت کا آخری مورچہ	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۳ جولائی ۲۰۱۸ء
۴۲۔	زیر آسماں	شکیل عادل زادہ: ایک خواب خوش رنگ	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۰جولائی ۲۰۱۸ء
۴۳۔	زیر آسماں	نیشنل کالج: برطانوی راج کے خلاف مزاحمت کا استعارہ	۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۷ جو لائی ۲۰۱۸ء
۴۴۔	زیر آسماں	راولپنڈی کی بینک روڈ	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۴جولائی ۲۰۱۸ء
۴۵۔	زیر آسماں	شہیدوں کا چمنستان	۴	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۳۱جولائی ۲۰۱۸ء
۴۶۔	زیر آسماں	آج تم یاد بے حساب آئے	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۷ اگست ۲۰۱۸ء
۴۷۔	زیر آسماں	حاجی صاحب ترنگ زئی مزاحمت کا استعارہ	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۴اگست ۲۰۱۸ء
۴۸۔	زیر آسماں	کٹاس راج اور آنسوؤں کا تالاب	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۱اگست ۲۰۱۸ء
۴۹۔	زیر آسماں	تعلیم: قومی ترجیحات کی نئی صف بندی	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۸اگست ۲۰۱۸ء
۵۰۔	زیر آسماں	راولپنڈی کی کالج روڈ	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۱ ستمبر ۲۰۱۸ء
۵۱۔	زیر آسماں	حسن مہیب مراد: وہ ہم نفس ہم نفس ہمارا	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۸ستمبر ۲۰۱۸ء
۵۲۔	زیر آسماں	تعلیم اور آزادی اظہار	۱۲	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۵ستمبر ۲۰۱۸ء
۵۳۔	زیر آسماں	تعلیمی عدم مساوات	۹	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۴۔	زیر آسماں	سی جے پی کمیٹی برائے تعلیمی خدمات	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۹ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۵۔	زیر آسماں	یکساں نصاب: خواب سے تعبیر تک	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۶اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۶۔	زیر آسماں	تعلیمی حکمتِ عملی: معیار کا مسئلہ	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۳اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۷۔	زیر آسماں	اثاثہ	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۳۰اکتوبر ۲۰۱۸ء
۵۸۔	زیر آسماں	سکینہ	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۶نومبر ۲۰۱۸ء
۵۹۔	زیر آسماں	ماسٹر فضل صاحب	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء
۶۰۔	زیر آسماں	توپ مانکیالہ	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۷ نومبر ۲۰۱۸ء
۶۱۔	زیر آسماں	چراغ بدر	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۴ دسمبر ۲۰۱۸ء
۶۲۔	زیر آسماں	سجاد شیخ: خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۱دسمبر ۲۰۱۸ء
۶۳۔	زیر آسماں	طارق ملک: اے اہل زمانہ قدر کرو	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۸دسمبر ۲۰۱۸ء
۶۴۔	زیر آسماں	موہنجو داڑو: فاصلوں کی کمند سے آزاد	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۵دسمبر ۲۰۱۸ء

۶۵۔	زیر آسماں	سرکاری سکول: کیا تھے کیا ہو گئے	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱ جنوری ۲۰۱۹ء
۶۶۔	زیر آسماں	مری کی ایک شام	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۸ جنوری ۲۰۱۹ء
۶۷۔	زیر آسماں	امینہ سید: تمنا کا دوسرا قدم	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۵ جنوری ۲۰۱۹ء
۶۸۔	زیر آسماں	اک دور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۲ جنوری ۲۰۱۹ء
۶۹۔	زیر آسماں	مزاح اور صنفی شناخت	۹	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۰ جنوری ۲۰۱۹ء
۷۰۔	زیر آسماں	معاشرہ، تعلیم اور تبدیلی	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۵ فروری ۲۰۱۹ء
۷۱۔	زیر آسماں	ادب فیسٹول: خوش رنگ خوابوں کا اجرا	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۲ فروری ۲۰۱۹ء
۷۲۔	زیر آسماں	زبانیں مر رہی ہیں	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۹ فروری ۲۰۱۹ء
۷۳۔	زیر آسماں	کراچی اور کراچی	۷	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۶ فروری ۲۰۱۹ء
۷۴۔	زیر آسماں	پنجاب کی پہلی مزاحمت	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۲ مارچ ۲۰۱۹ء
۷۵۔	زیر آسماں	استاد، تعلیم اور تبدیلی	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۱۹ مارچ ۲۰۱۹ء
۷۶۔	زیر آسماں	ڈلا بھٹی، ساندل بار کا جھومر	۱۰	روزنامہ "دنیا" اسلام آباد	۲۴ مارچ ۲۰۱۹ء

ضمیمہ

انٹرویو: ڈاکٹر شاہد صدیقی

۱۔ آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

سرکاری ریکارڈ کے مطابق میری پیدائش ۱۹۵۷ء میں راولپنڈی کے ایک مضافاتی گاؤں میں ہوئی۔

۲۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ کب اور کہاں سے شروع ہوا؟

تعلیم کا سلسلہ راولپنڈی کے ایک علاقے مریڑ حسن کے سکول سے شروع ہوا یہاں میں نے تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد لا ل کُرتی کے ایک پرا ئمری سکول میں پانچویں تک پڑھا اور پھر سی بی ٹیکنیکل سکول طارق آباد(لال کُرتی) سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے بعد سر سید کالج چلا گیا اور ایم اے گورڈن کالج سے کیا پھر برٹش کونسل کے سکالر شپ پر بر طانیہ کی یونیورسٹی آف مانچسٹر سے ME TESOL کی ڈگری حاصل کی ۔ پی۔ایچ ڈی کے لیے کینڈین کا من ویلتھ سکا لر شپ پر یونیورسٹی آف ٹورنٹو گیا جہاں سے ۱۹۹۵ء میں پی ۔ایچ ڈی کی ڈگر ی حاصل کی۔

۳۔ آپ کا بچپن کس طرح کی مصروفیات سے گزرا؟

بچپن میں کھیل کود تو زندگی کا حصہ ہو تا ہی ہے ۔ مجھے کرکٹ کا شوق تھا اور محلے کی ٹیم میں چھٹی والے دن میچ کھیلا کرتے۔ اس کے علاوہ مجھے کتابیں اور رسا لے پڑھنے کا جنون تھا ۔ پرائمری میں ہی ادبی دنیا، نقوش جیسے رسالوں سے واقف تھا اورفر دوسِ بریں اور باغ و بہار جیسی کتابیں پڑھ لی تھیں اس کا بڑا سبب گھر کا ماحول تھا کیوں کہ اس زمانے میں میرے بڑے بھائی اور دو ماموں ایم اے اردو کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔

۴۔ آپ کی شادی کب ہوئی اور آپ کے بیٹے اور بیٹیاں کتنی ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں؟

میری شادی ۱۹۸۵ء میں ہوئی ماشاء اللہ دو بیٹے اور بیٹیاں ہیں دو شادی شدہ ہیں اور دوزیرِ تعلیم ہیں۔

۵۔ آپ کے والد محترم کیا کرتے تھے اور ان کا ادبی دنیا سے شغف کس حد تک تھا؟

میرے والد نہ تو معروف معنوں میں سکول اور کالج سے تعلیم یافتہ تھے نہ ہی کوئی سرکاری نوکری کرتے تھے البتہ وہ دینی علوم سے بہرور تھے ان کی لا ئبریری میں مختلف نوع کی کتا بیں تھیں وہ فارسی، اردو، عربی ، پنجابی پر عبور رکھتے تھے اور اردو، فارسی اور پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے۔

۶۔ آپ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں بتائیں؟

میرے والد اور والدہ ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے دونوں کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا کتب بینی اور دب شنا سی ہم بہن بھا ئیوں کو ورثے میں ملی۔ ان کے پاس محدود مال وسا ئل تھے لیکن انھوں نے اپنی اولاد کے لیے بہترین تعلیم و تر بیت کا اہتما م کیا۔

۷۔ آپ مختلف اداروں سے وابستہ رہے ان اداروں کے لیے اپنی خد مات کے حوالے سے بتائیں؟

مجھے ملک کے بہترین تعلیمی اداروں مثلاً آغا خان یونیورسٹی،لمز(LUMS)، غلام اسحٰق خان انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ سائنسز اینڈ ٹیکنا لوجی (GIKI)، لاہور سکول آف اکنامکس(LSE)جیسے اداروں میں کام کر نے کا اتفاق ہوا جہاں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور بساط پر خد مت بھی کی۔

۸۔ بطور کالم نگار آپ کا نام ہے تو کالم نویسی کی طرف آپ کا رجحان کب اور کہاں ہوا؟

کالم نگاری تو میں نے ۲۰۰۰ء میں انگریزی کے اخباردی نیشن سے شروع کی تھی۔ پھر ڈان اور دی نیوز میں باقاعدہ لکھتا رہا لیکن اردو کالم نگاری کا آغاز دوسال پہلے کیا مجھے یہ محسوس ہوا کالم میں آپ مختصر الفاظ میں اپنا نکتہ نظر دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

۹۔ آپ کے کالموں میں مختلف ادبی اصنافِ نثر کے رنگ ملتے، یہ رنگ آپ کی تحریروں میں کیوں جھلکتے ہیں؟

میرا اپنا مضمون انگریز ی ادب ہے لیکن اردو ادب سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ مجھے کتا بیں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ یوں بہت سے مختلف رنگ میری تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

۱۰۔ آپ کی ذاتی دلچسپی کس قسم کے کالم تحریر کرنے کی طرف زیادہ ہوتی ہے؟

میری ذاتی پسند ادب، تاریخ اور فلاسفی کا امتزاج ہے۔

۱۱۔ چونکہ آپ کا شمار اہم ادبی کالم نگاری میں لیا جاتا ہے ۔ لہٰذا آپ پر کئی لکھاریوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں لکھا ہو گا کیا آپ ان کے حوالے سے بتائیں گے؟

ان کی آراء آپ انٹر نیٹ سے لے سکتی ہیں۔

۱۲۔ آپ کا اسلوب بیان ادبی ہے ادبیت کا یہ رنگ کیسے آیا؟

پرائمری سکول سے میں ادبی رسائل اور کتابیں پڑھنے لگ گیا تھا اس کی بڑی وجہ گھر کا ماحول تھا میرے بڑے بھائی اور دو ماموں ایم اے اردو کی تیاری کر رہے تھے اور گھر میں کتابوں کی فراوانی تھی۔

۱۳۔ آپ کس ادیب کی تحریروں کو زیادہ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں؟

میرا تعلیمی پس منظر انگریزی کا ہے اسی مضمون میں ایم اے اور پی ۔ایچ ڈی کیا اردو ادب سے بھی گہری دلچسپی ہے لہٰذا میرے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

۱۴۔ کالم کی تیاری کے حوالے سے بتائیں کہ آپ اس کی تیاری کے لیے باقاعدہ تحقیق کرتے ہیں؟

میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر کالم میں قاری کو کچھ نیا پن ملے اس لیے کالم لکھنے سے پہلے منتخب موضوع کے حوالے سے تحقیق کرتا ہوں۔

۱۵۔ آپ کے اسلوب میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آئی ہے یا پھر شروع سے لے کر اب تک ایسا ہی ہے؟

میں نے ۲۰۰۰ء سے انگریزی میں لکھنا شروع کیے اور ۲۰۱۸ء تک انگریزی کے معروف اخبارات دی نیشن ، ڈان، اور دی نیوز کے لیے کالم لکھتا رہا یہ کالم زیادہ تر تعلیم اور زبان کے حوالے سے ہوتے تھے۔ تقریباً دو سال پہلے میں نے اردو کالم لکھنا شروع کیے اس میں معلومات کے ساتھ ادبی رنگ بھی شامل تھا یوں یہ انگریزی کے کالموں سے مختلف ہے۔

۱۶۔ آپ کی نظر میں ایک کالم نگار کو کیسا ہونا چاہیے؟

ایک کالم نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اپنے تجزیے کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

۱۷۔ تاریخی مقامات کے بارے میں تمام تر معلومات آپ کیسے اکٹھی کرتے ہیں کیا کسی قسم کی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے؟

بہت سے تاریخی مقامات جن پر میں نے کالم لکھے وہاں میں خود گیا وہاں کے گردو پیش کو محسوس کیا اور پھر ان کے بارے میں کالم لکھا جن جگہوں پر میں خود جا نہیں سکتا۔ ان کے بارے میں کتابوں، رسالوں اور لوگوں سے معلومات اکٹھی کیں۔

۱۸۔ آپ کی تحریر کردہ انگریزی کتب کی تعداد زیادہ ہے اور اردو کتب کی تعداد کم ہے ، ایسا کیوں ہے؟

اس کی وجہ بہت سا دہ ہے کیوں کہ میرا اپنا مضمون انگریزی ہے اس لیے میری زیادہ کتا بیں انگریزی میں ہیں صرف ایک ناول" آدھے ادھورے خواب" اردو میں ہے۔

۱۹۔ آپ نے اپنی زندگی میں کن شخصیات سے سیکھا؟

سکول، کالج یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ اپنے خاندان اور معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے ملے جنھوں نے مجھے انسپا ئر کیا اور جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

۲۰۔ آپ کی ماضی کی بہترین یادیں کہاں سے وابستہ ہیں؟

ماضی کی بہترین یادوں کا تعلق ان دنوں سے ہے جب روزگار کے مسائل کا آغاز نہیں ہوا تھا بچپن اور طالب علمی کے دور سے بہت سی خوب صورت یادیں جڑی ہو ئی ہیں۔

۲۱۔ آپ نے بیرونِ ملک میں بہت سا وقت گزارا آپ کو وہاں کے تعلیمی نظام اور یہاں کے تعلیمی نظام میں کوئی فرق نظر آتا ہے؟

بنیادی فرق امتحان کا نظام ہے ہمارے ہاں امتحان قا بلیت کا نہیں صرف یاداشت کا ہو تا ہے اسی لیے یہاں رٹا سسٹم ہے جس سے بچے اچھے گریڈ تو لے لیتے ہیں لیکن ان میں جدتِ فکر نہیں آتی۔

۲۲۔ آپ کے ناول "آدھے ادھو رے خواب" پر تحقیقی نوعیت کا کام ہو چکا ہے اور اب آپ کے اردو ناولوں پر ایم فل کی سطح پر کام کیا جا رہا ہے آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سو چا تھا مجھے خوشی ہے کہ اس ناول کو تین پبلشرز نے شائع کیا اس کا پنجابی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے ۔ سندھی اور پشتو کے ترجمے جلد شائع ہو نے والے ہیں۔

۲۳۔ ادب میں آپ کی پسندیدہ صنف کو نسی ہے؟

اردو نثر سے مجھے دلچسپی ہے لیکن یہ نثر بھاری بھر کم الفاظ کے بجائے سادہ زبان میں ہونی چاہیے۔

۲۴۔ آپ مختلف جگہوں پر انتظامی عہدوں پر فائز رہے سب سے زیادہ تخلیقی صلا حیتوں کے حوالے سے موزوں جگہ کون سی رہی؟

میرا سب سے زیادہ تخلیقی کام لاہور سکول آف اکنامکس کے قیام کے دوران ہوا۔

۲۵۔ آپ نے علا مہ اقبال اوپن یونیورسٹی کو جدید دور سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کر دار ادا کیا اس سب کا پس منظر بتائیں؟

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں مجھے بطورِ وائس چانسلر (۲۰۱۴ء تا۲۰۱۸ء)تک کام کرنے کا موقع ملا اس دوران ہم نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کی علمی ادبی ، تحقیقی اور سماجی سر گرمیوں کا مرکز بنا دیا جائے مجھے خوشی ہے کہ ہم نے بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

۲۶۔ آج کل آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

آج کل میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز میں فیکلٹی آف سو شل سا ئنسز کے ڈین کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی